قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل الاشتراک
سالانہ
پاکستان ——— ۴۸ روپے
غیر ممالک ——— ۱۱۰ روپے

ٹیلیفون

خط و کتابت
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ
۴
چار روپے

جلد (۴۰) | ستمبر ۱۹۸۷ء | نمبر ۹

فہرست

۱۔ لمعات ۳
۲۔ حصولِ پاکستان کے حقیقی محرکات ۱۳
۳۔ نظریۂ پاکستان کیا ہے؟ ۲۲
(محترم پرویز صاحبؒ)
۴۔ دین کی باتیں۔ (محترمہ ثریا عندلیب) ۳۲
۵۔ حقائق و عبر ۳۵
۱۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا غلامی کے جواز پر اصرار
۲۔ قربانی کی کھالوں کا کرشمہ
۳۔ شریعت بل اور وفاقی شرعی عدالت
۴۔ کہیں تم مسلمان تو نہیں ہو گئے۔
۵۔ شریعتِ اسلامیہ کی جامعیت ابدیت
۶۔ بزمِ مذاکرہ ۴۲
۷۔ حسنِ تحریر (محترم محمد عمر دراز) ۵۱
۸۔ WHAT IS WRONG WITH US? ۶۰
(مس شمیم انور)

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: شیخ عبدالحمید۔ مقامِ اشاعت: ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ: النور پرنٹرز، ۴۲ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور ۱۶۔

محترم پرویز صاحب
کی
رفیقۂ حیات بھی چل بسیں!

ادارہ طلوع اسلام اور طلوع اسلام ٹرسٹ شدید رنج و غم کے ساتھ احباب کو اطلاع دیتے ہیں کہ محترم پرویز صاحبؒ کی بیوہ، محترمہ اپا جان، مورخہ ۹ اگست ۱۹۸۷ء کو رحلت فرما گئیں۔ اور اسی دن انہیں محترم پرویز صاحب کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

مرحومہ نے جس صدق و وفا سے محترم پرویز صاحبؒ کے مشن میں ان کا ساتھ دیا اس پر محترم پرویز صاحب کی زبان پر اکثر ان کیلئے تحسین کے کلمات رہا کرتے تھے۔ مرحومہ مجسمۂ اخلاص و شفقت تھیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ انہیں جنت الفردوس میں مقامِ علیین عطا فرمائے۔ اور ...

ہم سب کو صبرِ جمیل!

لمعات

.... فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝ (۵۴/۱۵)

عہدِ رسالت مآبؐ میں جب مکی مہاجرین کو مدنی زندگی میں سکون، اطمینان، تمکّن اور قوت و حشمت حاصل ہوئی تو انہیں ان کی سابقہ زندگی اور بعد کے تغیرِ حالات کی یاد ان الفاظ میں دلائی گئی کہ:

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (۸/۲۶)

مکی زندگی میں تمہاری حالت یہ تھی کہ تم تعداد میں بھی قلیل تھے اور قوت کے اعتبار سے بھی بیحد کمزور تصور کیے جاتے تھے۔ تمہیں ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ مخالفین تمہیں اُچک کر نہ لے جائیں۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک محفوظ ٹھکانا دیا جہاں تم اکٹھے رہ سکتے ہو اور اپنی نصرت سے تمہیں تقویت پہنچائی اور زندگی کی خوشگواریاں عطا کر کے سامانِ نشو و نما بہم پہنچایا تاکہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر سکیں۔"

جو کچھ آیۂ جلیلہ میں کہا گیا ہے اس میں اور ملّتِ پاکستانیہ کی تقسیمِ ہند سے پہلے اور بعد کی زندگی میں بڑی گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ہماری موجودہ حالت قرآنِ کریم کی کسوٹی پر کیسے اُترتی ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ تقسیمِ ہند کے فیصلہ پر کانگرس کی طرف سے (آنجہانی) پنڈت جواہر لعل نہرو نے دستخط کیے تھے۔ وہ ایک طرف اس فیصلہ پر دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف قوم سے کہہ رہے تھے:

"ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت مسٹر جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں

کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔"

(PAKISTAN FACES INDIA PAGE - 99)

یہ تھا اعلان اس کانگرسی لیڈر کا جو بزعمِ خویش سیکولر نظام کا علمبردار تھا۔ لیکن دوسری طرف ہندوؤں کی جماعت 'ہندو مہاسبھا' کے صدر ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی نے جولائی ۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے سے صرف ایک ماہ پہلے کہا تھا:

ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیا جائے۔ اس حقیقت کے متعلق میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ خواہ یہ معاشی دباؤ سے ہو یا سیاسی دباؤ سے، یا اس کے لیے دیگر ذرائع اختیار کرنا پڑیں۔"

(آرگنائزر۔ مؤرخہ ۳۰ جولائی ۱۹۴۷ء)

دیوان چمن لال، جن کا تعلق ہندوؤں کے اعتدال پسند طبقہ سے تھا، نے یہ کہہ کر ہندوؤں کی ڈھارس بندھائی کہ:

"میں ناامید ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ تقسیم ہند ایک عارضی سا حادثہ ہے۔ اس کے باوجود ہم تیس کروڑ ہندوؤں کو، اس مقصد کے لیے جان تک دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔" (ایضاً)

یہ تھے عزائم ہندوؤں اور کانگرسی لیڈروں کے تقسیم ہند کے وقت پاکستان کے متعلق۔ ان کو سامنے رکھیئے اور آگے بڑھیئے۔

پاکستان کے چالیس سال، ہوسِ اقتدار، کشمکشِ اقتدار اور حصولِ اقتدار کی المناک داستان ہیں۔ جس دن اس ملکِ عزیز کے قصرِ مشیّد کی پہلی اینٹ رکھی گئی تھی، اُسی دن اس کی شکست و ریخت کے منصوبے بھی بننا شروع ہو گئے۔ ان منصوبوں کا ہدف، اوّلاً "دو قومی نظریہ" اور ثانیاً نظریۂ پاکستان کو بنایا گیا جو پاکستان کے تشخص اور اتحاد کی علامت تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب کسی درخت کی جڑیں دیمک خوردہ ہو جاتی ہیں تو اُسے کھڑا رکھنے کی سب تدبیریں ناکام ہو جاتی ہیں اور زور دیا بدیر وہ درخت ہوا کے معمولی سے جھونکے سے زمین پر آگرتا ہے۔ گویا درخت اس وقت گرتا ہے جب اس کی جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ دو قومی نظریہ پاکستان کی بنیاد اور جڑ ہے، اس لیے پاکستان کی بقاء اور استحکام کے لیے ضروری ہے کہ اس نظریہ کا تحفظ کیا جائے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے نقوش لمحہ بہ لمحہ، روشن سے روشن تر ہوتے چلے جاتے مگر افسوس ایسا نہ ہو سکا اور برعکس اس کے

وہ زرّیں نقوش دھندلے پڑ گئے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ان نقوش پر اٹھی ہوئی عمارت مخدوش نظر آنے لگی۔ اور ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ دو قومی نظریہ سے اغماض برتنے کی پاداش میں پاکستان کا ایک عظیم حصّہ اس سے کٹ کر الگ ہو گیا۔

موقعہ کی مناسبت سے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیان کر دیا جائے کہ دو قومی نظریہ اور نظریۂ پاکستان کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ارشادِ الٰہی ہے:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۔ (۶۴/۲)

خُدا وہ ہے جس نے تم سب اِنسانوں کو پیدا کیا۔ پھر تم (تصورِ حیات کی بنا پر) دو گروہ بن گئے، یعنی ایک مومن اور دوسرے کافر (غیر مسلم)۔

یہی نہیں، بلکہ مومنوں کے لیے ضروری قرار دیا کہ:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۔ (۵/۴۸)

جو کچھ اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے (قرآن) اس کے مُطابق حکومت قائم کرو؛

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۵/۴۴)

اور جو قانونِ الٰہی (قرآن) کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

گویا مومن وہ ہوئے جو قرآنِ حکیم کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں اور اُس کے مُطابق انفرادی اور اجتماعی فیصلے کریں اور کافر (غیر مسلم) وہ ٹھہرے جو قرآنِ حکیم کے مطابق حکومت قائم نہ کریں۔ چنانچہ بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے نومبر ۱۹۴۵ء میں ایڈورڈ کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

..... ہمارا دین ہمیں ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

اگست ۱۹۴۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کو انٹرویو دیتے ہوئے آپ نے فرمایا:

..... اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لیے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوگی۔

پاکستان اس وقت ایسے خطرات سے دوچار ہے جن کی نزاکت اور شدّت کی مثال اس کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ہمارے ہمسایہ ملک کے مشئوم عزائم یوں تو پہلے دن ہی سے ظاہر تھے لیکن اب وہ اس طرح کھُل کر سامنے آ گئے ہیں کہ اِن پر کسی قسم کے دھوکے کا پردہ یا شک کی چلمن باقی نہیں رہی۔ اب یہ حقیقت بے نقاب ہو گئی ہے کہ بھارت کی تمام تر تخریبی کارروائیوں کا رُخ پاکستان کی طرف ہے اور پاکستان بے یار و مددگار

نظر آتا ہے۔ انہوں نے تو آغاز ہی میں کہہ دیا تھا کہ وہ ایسے حالات پیدا کر دیں گے جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جُھک کر ان سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں بِلا لیجئے۔ چنانچہ سندھ کے معروف لیڈر جی۔ ایم۔ سیّد جو کبھی مسلم لیگی تھے، اپنے ہندوستان کے حالیہ دورے کے دوران پاکستان اور ہندوستان کی کنفڈریشن کی اسکیم ہندوستان سے کر گئے تھے، وہاں آل انڈیا فریڈم فائٹرز آرگنائزیشن کی طرف سے اپنے اعزاز میں ہونے والی تقریب میں فرماتے ہیں کہ :

> "کنفڈریشن کے قیام سے گاندھی کے آزاد اور متحدہ بھارت کا خواب، جو میری بھی خواہش ہے، پُورا ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ کنفڈریشن کے قیام سے جدید فوجی ہتھیاروں پر خرچ ہونے والی بھاری رقوم بچ جائیں گی جو عوام کی خوشحالی اور ترقی کے لیے استعمال کی جاسکتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ سندھیوں کو ان کی اپنی سرزمین پر اقلیت بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ برِصغیر جسے اشوکا، اکبر نے سیاسی شکل دی تھی اب ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بڑی طاقتوں کی سپلے گراونڈ بن چکا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بڑی طاقتوں کو ان کی سرگرمیوں کا جواب اسی صورت میں دیا جا سکتا ہے کہ اگر ہم ایک مشترکہ مقصد کے لیے متحد ہو جائیں۔ انہوں نے کہا میں مہاتما گاندھی اور ان کے عدم تشدد کے فلسفہ کا مدّاح رہا ہوں۔"
>
> (روزنامہ جنگ۔ مؤرخہ ۱۱ر جولائی ۱۹۸۷ء
> کالم ۷، ۸ صفحہ اوّل اور کالم ۸ صفحہ ۸)

ہم نے پھر بھی رُک کر نہ سوچا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے اور نہ ہی اس کے سدِّباب کی طرف دھیان دیا۔ (اگرچہ وزیرِاعظم نے کہا ہے کہ حکومت اس کا نوٹس لے گی اور جی۔ ایم۔ سیّد کی جواب طلبی ہوگی) (جنگ ۱۱ر جولائی ۱۹۸۷ء) لیکن، ہم حسبِ سابق ساحل سے بے خبر، بحرِ ظلمات میں بڑھتے ہی رہے اور نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ پاکستان کی بقا تارِ عنکبوت کا ہیولیٰ نظر آنے لگی ہے ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینہ اِدراک میں ہے

جب کوئی قوم ایسے حالات میں گھِر جائے تو خود اس کی ہستی خطرہ میں ہوتی ہے۔ قوموں کی ہستی خطرہ میں ہونے سے مراد یہ نہیں کہ اس قوم کا وجود طبیعی طور پر باقی نہیں رہتا۔ قوموں کی ہستی ان کی سیاسی آزادی سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر کسی قوم سے اس کی سیاسی آزادی چھین جائے تو اس کی جداگانہ ہستی ختم ہو جاتی ہے۔ تحفّظِ خویش کا جذبہ ہر ذی حیات کی جبلّت میں داخل ہے۔ یعنی جب کوئی ذی حیات

دیکھے کہ اُس کی ہستی خطرہ میں ہے تو وہ اس کی حفاظت کے لیے اپنی پوری قوتوں کو مجتمع کرتا اور انہیں استعمال میں لاتا ہے۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے، حتیٰ کہ بعض اوقات اِس کوشش میں اپنی جان تک بھی دے دیتا ہے۔ چیونٹی ننھی سی جان ہے، جب اُس کے راستے میں خطرے کا ننکا آجائے تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی حفاظت کے لیے کس طرح ہاتھ پاؤں مارتی ہے اور کس قدر مضطرب اور بے قرار نظر آتی ہے۔ کیا ہم اس ننھی سی چیونٹی سے بھی گئے گذرے ہیں کہ تحفظِ خویش کی خاطر ہی سہی، اپنی قومی بقا کے لیے کچھ نہ کر پائیں۔

اس وقت ارضِ پاکستان نفاق، تخریب کاری، ہنگاموں اور فسادات کی لپیٹ میں ہے۔ اُدھر آسمان پہ مایوسی، بد دلی اور خوف و ہراس کے سیاہ بادل چھائے ہُوئے ہیں۔ دھوکا، فریب اور فراڈ کی گرم بازاری ہے۔ سمگلنگ جو ملکی معیشت کو گھُن کی طرح کھا رہی ہے، اس کی روک تھام نہیں ہو رہی۔ منشیات کا کاروبار اندرون ملک اور بین الاقوامی سطح پر کھُلے بندوں ہو رہا ہے۔ بات یہیں تک محدود نہیں بلکہ نوجوان نسل، جن کے ہاتھ میں پاکستان کا مستقبل ہے، ان کے عادی ہوتے جا رہے ہیں — اور بستے رستے گھروں کے چراغ ٹمٹماتے نظر آ رہے ہیں۔ پاکستان کے عوام جو کبھی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کا منظر پیش کرتے تھے، مایوسیوں کے تھپیڑوں سے لرزاں نظر آتے ہیں۔ اگرچہ ان کے سدِ باب کے لیے حکومت کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے لیکن عوام بھی ان سے بری الذمہ نہیں۔ آگ تو اُن کی بے راہ روی کی لگائی ہوئی ہے۔ کیا ایسے حالات میں قوم، کسی خارجی جارحیت کے خلاف اپنی مدافعت کر سکتی ہے۔ اگرچہ حکومت یہ اعلان کرتی رہتی ہے کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں، حکومت ان سب حالات سے باخبر ہے، ان کے سدِباب کا ضروری بندوبست کر لیا ہوا ہے، لیکن حکومت نے یہ بھی کبھی سوچا کہ عوام کے تعاون کے بغیر کوئی منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لیکن دوسری طرف صورتِ حال یہ ہے کہ عوام بھی اَن گنت گروہوں، تنظیموں، پارٹیوں اور مذہبی فرقوں میں منقسم ہیں۔ اُن کا آپس میں بھی اتفاق یا اتحاد نہیں جو حکومت کے معاون ادارے یعنی پالیمنٹ کی کیفیت یہ ہے کہ اُس میں بھی گروپ بندی ہے۔ جو لوگ باہر ہیں اُن کے لیڈر اس جوڑ توڑ میں لگے رہتے ہیں کہ کس طرح ایسی صورت پیدا کی جائے جس سے حکومت کی کرسیاں اُن کے قبضہ میں آجائیں۔ اُن کے سامنے اس سے زیادہ اہم سوال کوئی نہیں کہ کس طرح فریقِ مقابل کو کمزور اور اپنی پارٹی کو طاقت ور بنایا جائے۔ ایک دوسرے پر خوب کیچڑ اُچھالا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ اس مقصد کے لیے کیا جا رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح حصولِ اقتدار کے راستے ہموار کیے جائیں۔ ارکانِ پالیمنٹ اس کوشش میں غلطاں و پیچاں ہیں کہ ان کی پوزیشن قائم رہے۔ اُدھر جن کے ہاتھوں میں اقتدار ہے اُن کی ہر ممکن کوشش ہے کہ اُن کی مسندیں محفوظ رہیں۔ یہ سب کچھ

عین اُس وقت ہو رہا ہے جب ملک پر ہر طرف سے خطرات کے گھنے بادل اُمنڈے چلے آ رہے ہیں اور اس کی سرحدوں پر دشمن کے سپاہی چلتے پھرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ گویا

"روم جل رہا ہے اور نیرو بانسری بجا رہا ہے۔"

ہماری ترقی کا یہ عالم ہے کہ ہم آج تک نہ تو اپنی آزادانہ حیثیت کا تعین کر سکے ہیں اور نہ ہی آزادانہ پالیسی وضع کر سکے ہیں۔ اگر کچھ ہُوا ہے تو غیروں کے مفاد کی خاطر ہُوا ہے۔ اگرچہ پاکستان نے آزادی (FREEDOM) حاصل کر لی ہے لیکن INDEPENDENCE سے ابھی تک محروم ہے۔ انڈی پینڈنس سے مراد استغناء ہے جو ہمیں میسر نہیں۔ استغناء کا مطلب ہے کسی کی محتاجی یا احتیاج نہ ہونا۔ گویا استغنار محتاجی کی ضد ہے۔ اس طرح نہ تو ہماری کوئی آزادانہ پالیسی ہے اور نہ ہی ہم اپنے معاملات میں خود کفیل ہیں۔ ہر وقت دوسروں پر انحصار کرتے رہتے ہیں اور بیرونی ممالک کی امداد پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ اگر آج بیرونی امداد پر کوئی قدغن لگا دی جائے یا معطل کر دی جائے، یا وقتی طور پر مؤخر ہو جائے تو ہم اپنے حوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ لیکن ہم نے یہ کبھی نہ سوچا کہ ایسی امداد ہماری فکری پرواز میں برقِ سوزاں کی طرح مہلک ہے۔ اسی لیے حکیم الامت، علامہ اقبالؒ نے کہا تھا ؎

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اس سلسلہ میں نبی اکرمؐ کا عہدِ مبارک سامنے لائیے۔ اُس وقت وہ کون سے وسائل و ذرائع تھے جن پر انحصار کر کے اُنھوں نے ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا تھا۔ جب اس وقت کی فتوحات کا مطالعہ کرتے ہیں تو انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ اُن کے پاس یہ قوت و عظمت اور بڑھتے چلے جانے کی طاقت کہاں سے آ گئی۔ حق و باطل کا پہلا معرکہ بدر جہاں داعیانِ حق کی کُل تعداد ۳۱۳ اور مقابلہ میں قریش کی فوج ایک ہزار سے متجاوز تھی، مسلمانوں نے یہاں وہ کارنامہ انجام دیا کہ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہ تو قریش مدینہ کے خلاف جنگ تھی، ذرا سامنے لائیے جنگِ خندق جس میں قریش، یہود اور اُن کے حلیف قبائل مسلمانوں کے خلاف متحد ہو کر میدان میں اُتر آئے تھے۔ اسی نسبت سے اسے جنگِ احزاب بھی کہتے ہیں۔ اس کے باوصف کفار کو مسلمانوں کے ہاتھوں شکست فاش ہوئی۔ یہ سب کیا تھا؟ نہ ہی افرادی قوت کی فراہمی اور نہ ہی ساز و یراقِ مبارزت کی فراوانی۔ اگر کچھ تھا تو جذبۂ ایمانی جو اُن کے اندر قرآن کے اتباع سے پیدا ہوا تھا۔ کیونکہ ع

عشق جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے

تحریکِ پاکستان کے دوران آپ عزتِ نفس، عزم و یقین، خودداری اور خدا پر بھروسہ کا مظاہرہ بانیٔ پاکستان قائداعظمؒ محمد علی جناحؒ کی ذات کے اندر دیکھ چکے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ انگریز کا پلڑا ہندو کی طرف جھکا ہوا تھا۔ ہندو انگریز کی مدد سے مسلمانوں کو غلام بنا کر ان پر حکومت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بے تیغ و سناں لڑنے والا سپاہی اللہ کے بھروسہ پر ان کے سامنے ڈٹ گیا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جب مارچ ۱۹۳۹ء میں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں ایک ایسا بل پیش ہوا جس سے مسلمانوں کے حقوق کی پامالی ہوتی تھی تو قائداعظمؒ نے اس بل پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

"میں، انگریز اور ہندو دونوں کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ تم الگ الگ یا دونوں متفق ہو کر بھی ہماری روح کو فنا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ نہ تم اس تہذیب کو مٹا سکو گے جو ہمیں ورثہ میں ملی ہے۔ ہمارا نورِ ایمان زندہ ہے، زندہ رہا ہے اور زندہ رہے گا۔ تم ہم پر ظلم و ستم کرو، ہمارے ساتھ بدترین سلوک کرو، ہم ایک فیصلہ پر پہنچ چکے ہیں اور ہم نے یہ عزم کر لیا ہے کہ ہم لڑتے لڑتے مر جائیں گے۔"

انہوں نے ۱۹۴۵ء میں پشاور کے ایک جلسۂ عام میں فرمایا۔

ہمارا کوئی دوست نہیں۔ ہمیں نہ انگریز پر بھروسہ ہے نہ ہندو پر۔ ہم دونوں کے خلاف جنگ جاری رکھیں گے۔ خواہ وہ آپس میں متحد ہی کیوں نہ ہو جائیں۔

اُس زمانہ میں، چین میں جنرل چیانگ کائی شیک برسرِ اقتدار تھے جن کے پنڈت جواہر لعل نہرو سے بڑے گہرے مراسم تھے اور دوسری طرف اُن کا امریکہ پر بھی بڑا اثر تھا۔ ان سب کی تجویز یہ تھی کہ ہندوستان کے مسئلہ کو کسی طرح اقوامِ متحدہ میں لے جایا جائے۔ اس پر نومبر ۱۹۴۱ء میں قائداعظمؒ نے علی گڑھ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

چین اور امریکہ کی متحدہ قوت بھی ہم پر کوئی ایسا دستور مسلط نہیں کر سکتی جس میں مسلمانوں کو قربان کر دیا گیا ہو۔ اگر متحدہ اقوام کسی ایسی مجنونانہ حرکت کا ارتکاب کر بیٹھیں تو اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اپنی حفاظت کے لیے ایک چیونٹی بھی پلٹ کر حملہ کر دیا کرتی ہے۔ ان غیر ملکی سنگینوں کی پروا نہ کرتے ہوئے جن کے سائے میں کانگرس راج رچایا جا رہا ہوگا، ہم ملک کے سارے نظام میں زلزلہ ڈال دیں گے اور اُسے معطل کر کے رکھ دیں گے۔

کیا پاکستان کی تاریخ کے اندر اس سے بڑھ کر خودداری اور عظمتِ کردار کی درخشندہ مثالیں کہیں ملتی ہیں؟ ان کے پاس جذبۂ ایمانی کے سوا وہ کون سی قوت تھی جس کے بل بوتے پر انہوں نے سُپر طاقتوں

کے دانت کھٹے کر دیئے اور کامیاب و کامران ساحلِ مراد تک جا پہنچے۔ کیسی حسین مثال ہے استغنا کی۔ اگر مسلمان سمجھے تو یہ دولت آج بھی اُن کے پاس ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تُو — قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تُو — دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و سناں
تُو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان حقائق پر ایمان تو کجا، ہمارا تو اپنی ذات پر بھی ایمان نہیں۔ اگر اپنی ذات پر ہمارا ایمان ہوتا اور ہم صاحبِ کردار ہوتے تو ہم نے قرآنِ کریم کے واضح حکم (۳/۱۱۸، ۴/۱۴۴، ۵/۵۱) کے خلاف اغیار کو (جو غیر مسلم ہیں) اپنا راہنما اور سرپرست نہ بنایا ہوتا اور اُن کے مفاد کے تحفظ کے آلۂ کار نہ بنے ہوتے اور آج ہمارا ملک انتشار و ابلاس کی آماجگاہ نہ بنا ہوتا۔ اگر ہم نے قرآنی احکام و اقدار کے مطابق نظام قائم کر دیا ہوتا تو ملک کے اندر امن و سکون کی فضا قائم ہو گئی ہوتی۔ پھر نہ کسی اندرونی گڑبڑ..... کا خوف ہوتا اور نہ کسی بیرونی جارحیت کا ڈر (۲/۳۸)

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے ضمیر کُن فکاں ہے زندگی

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ چالیس سال ہونے کو آئے، ہم قرآن کا نظام نافذ نہ کر سکے جس کیلئے یہ خطۂ ارض حاصل کیا گیا تھا۔ کیا ہم نے امانت میں خیانت نہیں کی؟ ہم پاکستان کو اسلامی ریاست تو کہتے ہیں لیکن جس نسبت سے یہ اسلامی ریاست ہے وہ نسبت کیا ہوتی؟ چند تعزیراتی اقدام کر کے تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قرآن کا قانون نافذ ہو گیا ہے۔ قرآن کے قانون کے نفاذ کے لیے تو جرأتِ رندانہ اور جذبِ قلندرانہ کی ضرورت ہے۔ اگر ہم ایسا نہیں کر سکتے تو پھر اس کے سوا کیا ہے کہ ؎

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے! — مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق — کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

اور یہ بھی کہ ؎

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے — وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نمازِ روزہ و قربانی و حج، — یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں ہے

اور قرآنی احکام و اقدار کے مطابق زندگی اسی 'تُو' کو زندہ و پایندہ رکھتی ہے۔

آخر میں اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے جہاں مدنی زندگی میں جماعتِ مومنین سے کہا گیا تھا کہ تم اپنی سابقہ حالت پر غور کرو۔ تم وہاں اقلیت میں تھے اور کمزور بھی تصور کیے جاتے تھے۔ خدا نے تمہیں اپنی عنایات سے نوازا۔ تمہیں رہنے کے لیے محکم ٹھکانہ دیا، قوت و شوکت عطا کی، نشوونما کا نہایت خوشگوار سامان عطا کیا۔ یہ سب انعامات اس لیے عطا کیے کہ دینِ خداوندی کو متمکن کرنے کے لیے تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر سکیں۔ اس سلسلہ میں انہیں کچھ ہدایات دی گئیں کہ:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ٥ (۸/۲۴)

اے جماعتِ مومنین! جب اللہ اور اس کا رسولؐ تمہیں اس بات کی طرف بلائے جس میں تمہاری حقیقی زندگی کا راز پوشیدہ ہے تو تم اس دعوت پر لبیک کہا کرو۔

اور پھر فرمایا کہ:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ٥ (۸/۲۷)

اے جماعتِ مومنین! تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم نہ تو اس نظامِ خداوندی سے خیانت کرو جس کے لیے تمہیں یہ نعمتیں دی گئیں اور نہ ہی ان ذمہ داریوں کی ادائیگی میں خیانت کرو جو تمہارے سپرد کی جائیں۔ تم جانتے ہو کہ ایسا کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا؟

اور اس روش کے نتیجہ کی وضاحت بھی اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر خود ہی کر دی کہ:

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۸/۲۵)

یاد رکھو! اس قسم کی خیانتوں سے وہ تباہی آتی ہے جو مملکت کے ظالم طبقے تک ہی محدود نہیں رہا کرتی، سارے کے سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہے۔ اس لیے خدا کا قانونِ مکافات اپنی نتیجہ خیزیوں میں بڑا سخت واقع ہوا ہے۔ تم ایسا انتظام کرو کہ اس قسم کی تباہی کا شکار نہ ہو جاؤ۔

یاد رکھیئے! چالیس برس کی مسلسل اجتماعی اور انفرادی خیانتوں سے ہم آج اس مقام پر آ کھڑے ہوئے ہیں جہاں خدا کی تنبیہہ آنے والے خطرات سے ہمیں پکار پکار کر آگاہ کر رہی ہے اور سوال کر رہی ہے کہ:

فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۱۵/۵۴)

کیا کوئی ہے جو اس نوشتۂ دیوار سے عبرت حاصل کرے؟

اگر نہیں تو پھر ؎

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایسا نہ ہو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ خدا سے باندھے ہوئے عہد کی صدقِ دل سے ایفا کی جائے، ہر طرف سے صرفِ نظر کر کے پاکستان کے اندر قرآنِ خالص کا نظام قائم کیا جائے جس کے نفاذ کے وعدوں کے تصدق یہ خطۂ زمین ہمیں عطا ہوا تھا۔ کیونکہ:

وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ ۝ (۳۸/۴۷)

اگر تم قوانینِ خداوندی سے اعراض برتو گے (منہ پھیر لو گے)، تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا۔ پھر وہ تمہارے جیسے نہیں ہوں گے۔

بقیہ: حقائق وعبر

نہیں جو انہیں بتلائے کہ اللہ کی شریعت کا دامن اس نقص سے پاک ہے اور اگر وہ کتاب و سنت کی طرف رجوع کرتے تو انہیں اس زمانے کے لیے ویسے ہی اصلح و اوفق قوانین مل جاتے جس طرح پچھلے عہدوں کے لیے مل چکے ہیں۔"

(ترجمان القرآن، دوم صہ ۱۲۶)

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کو اگر واقعی شریعت اسلامیہ کی جامعیت اور ابدیت پر اس طرح کا پختہ یقین تھا تو پھر انہوں نے اسلام کی سربلندی کے لیے کام کرنے کی بجائے ہندو کا شوبوائے ــــــ بن کر پاکستان کے قیام میں روڑے اٹکانے کے لیے اپنی زندگی کیوں وقف کر دی تھی۔ ان ہندوؤں کے عزائم ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ وہ برصغیر سے اسلام کو ختم کرانا چاہتے تھے اور حیرت کی بات ہے کہ شریعت اسلامیہ کی جامعیت پر یقین رکھنے والا عالم دین ان کی اس مہم میں ان کا ساتھی بن جاتا ہے۔ اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جائے کہ "یہ گاندھی کے ہاتھ پر بیعت" کی کرشمہ سازی تھی، کہ دورالہلال کا ابوالکلام آزاد یہ کہنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ

"عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں"

حصولِ پاکستان کے حقیقی محرّکات
اور
مزعومہ دانشورانِ قوم کی بوالعجبیاں!

پچھلے چند ہفتوں سے یومِ استقلالِ پاکستان کے سلسلہ میں پاکستان ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والے پروگراموں میں (جن میں بطور خاص پاکستان کے معروف دانشوروں کے انٹرویوز نشر کیے جاتے رہے ہیں) اس باطل مفروضہ کو تکرار کے ساتھ قوم کے سامنے پیش کیا جاتا رہا ہے کہ تحریک حصول پاکستان کا جذبۂ محرکہ ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کا معاشی استحصال تھا۔ ٹیلی ویژن پر آنے والا ہر (بزعم خویش) دانش ور اسی ایک بات کو بلا سوچے سمجھے دہرائے چلا جاتا رہا ہے۔ اور کسی کا دھیان اس طرف نہیں گیا کہ اندھیروں میں بھٹکنے اور ٹامک ٹوئیاں مارنے سے کہیں بہتر ہوتا کہ ہم اپنے اس عظیم قائدؒ سے بھی پوچھ لیتے جس نے اپنی جان کی بازی لگا کر یہ ملک حاصل کیا اور اسے ہم نااہلوں کے سپرد کر کے چل بسا کہ اُس نے ایسا کیوں کیا اور پاکستان حاصل کرنے سے اُس کا مقصد کیا تھا؟ کیوں اُس نے اپنی جان کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے آخری سانس تک یہ جنگ لڑی اور ہمیں آزاد قوموں کی صف میں لا کھڑا کیا؟

کیا ہمارے دانشور فی الواقع حصول پاکستان کے محرّکات سے بے بہرہ ہیں یا ہمارے (خود ساختہ) دانشور اس معاملہ میں دیانت سے کام نہیں لے رہے اور ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت (شعوری یا غیر شعوری طور پر) حصول پاکستان کے بنیادی اور حقیقی مقاصد کو نئی نسل سے چھپائے رکھنے کا فریضہ انجام دے کر پاکستان دشمن عناصر کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں؟ ایسا کیوں ہے؟ اس مکروہ سازش میں کون کون ملوّث ہے؟ اس بے سرے راگ کے تار کون پسِ پردہ ہلا رہا ہے؟ کیا یہ بات ہماری قومی حکومت کے نوٹس میں نہیں آتی کہ بابائے قوم حضرت قائدِ اعظم علیہ الرحمۃ کے واضح ارشادات کی موجودگی میں دانشورانِ قوم ہمارے شاہین بچوں کو کس قسم کی خاکبازی کی تعلیم دے رہے ہیں؟ اور کیا یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی کہ اس قسم کے گمراہ کن پراپیگنڈہ کے عواقب کس قسم کے دردناک عذاب کی شکل میں ہم پر وارد ہو سکتے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ اور کیا پھر ہمیں کوئی بھی اس عذاب سے بچا سکے گا؟

کیا ہمارے ذرائع ابلاغ کے سامنے حکومت کی طرف سے کوئی جامع منصوبہ نہیں رکھا گیا کہ انہیں

نظریۂ پاکستان کو اُبھار اور نکھار کر قوم کے سامنے لاتے رہنا ہے اور نظریۂ پاکستان کے خلاف کام کرنے والوں کے پراپیگنڈہ کا سدِّ باب کرتے رہنا ہے۔ کہ اسی میں ہمارے مستقبل کی درخشندگیاں پنہاں ہیں۔ اور اسی میں ہماری سرفرازیاں پوشیدہ!

یہ امر بھی مسلّمہ ہے کہ ہر روز بلا استثناء پاکستان ٹیلی ویژن پر خبروں سے پہلے قائدِاعظمؒ کا ایک ارشاد تحریری شکل میں سامنے لایا جاتا ہے۔ کاش ہمارے دانشور اِن روزانہ پیش کردہ ارشادات قائدؒ ہی کی تفسیر و تشریح قوم کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر سکتے!

تحریکِ حصولِ پاکستان کے دوران اور حصولِ پاکستان کے بعد سے طلوعِ اسلامؒ نے وظیفۂ حیات کے طور پر اس فریضہ کو اپنے وسائل کی ممکنہ حدود تک سرانجام دیا ہے کہ ایسی کوششوں کو بے نقاب کیا جائے جن کا مقصد اُبھرنے والی نسل کی نگاہوں سے حقیقی اور بنیادی محرکاتِ حصولِ پاکستان کو پوشیدہ رکھنا ہے۔ اور اب بھی کسی کونے کی طرف سے ان مزموم کوششوں کے خلاف ایک لفظ سُننے میں نہیں آیا جو پاکستان ٹیلی ویژن سے بالاستمرار گمراہ کن پراپیگنڈہ کی شکل میں ایک نہ رکنے والے سیلاب کی طرح امنڈے چلا آ رہا ہے یہ فریضہ (چاہے ہمیں یہ کتنی بار بھی انجام کیوں نہ دینا پڑے) ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے ہی حصہ کی سعادت ہے اور اسے ہمیں ہی ادا کرنا ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ۔

آیئے ہم دیکھیں کہ پاکستان حاصل کرنے والے ہمارے قائدؒ کے اپنے الفاظ میں حصولِ پاکستان کے کیا محرکات تھے اور اُن کے نزدیک ان کی کیا اہمیت تھی؟

سب سے پہلے یہ دیکھیئے کہ قائدِاعظمؒ کی سیاست، معاشی یا سیاسی مقاصد پر مبنی تھی یا یہ خالصتہً دین کا تقاضا تھا۔ قائدِاعظمؒ کا حریف اوّل مسٹر گاندھی تھا۔ اس نے اعتراض کیا کہ مسٹر جناح خوامخواہ مذہب کو سیاست میں گھسیٹ لاتے ہیں۔ مذہب کو سیاست سے کیا واسطہ؟ اس کے جواب میں قائدِاعظمؒ نے یکم جنوری ۱۹۴۰ء کو مسٹر گاندھی کے نام ایک تفصیلی خط لکھا اور اس میں کہا کہ:۔

آج آپ (یعنی مسٹر گاندھی) اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے۔ لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے، وہ کون سی قوتِ محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح۔ تو آپ نے کہا تھا کہ "وہ خالص مذہبی جذبہ ہے"۔ (لہٰذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شُعبے ہو نہیں سکتے)۔ آپ تمدّنی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو نوعِ انسان کے معاملات

سے واسطہ نہیں، میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی عمل اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں، محض غوغہ آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے۔ لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔ (تقاریر قائداعظم۔ جلد اول صفحہ ۳۰-۱۳۹)

اس سے آگے بڑھیں تو قوم کے نام ۱۳ نومبر ۱۹۳۹ء کو ریڈیو پر قائداعظمؒ کا یہ پیغام ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس میں انہوں نے قرآنی تعلیم کے مختلف گوشوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا تھا:۔

معاشی احیاء ہو یا سیاسی۔ اسے آخر الامر زندگی کے کسی گہرے مفہوم پر مبنی ہونا چاہیئے اور مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیئے کہ ہمارے نزدیک زندگی کا وہ گہرا مفہوم، اسلام اور روحِ اسلام ہے۔ (تقاریر جلد اوّل صـ۱۰۸)

۲ مارچ ۱۹۴۴ء کو پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کانفرس کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے فرمایا کہ ذات برادری کی تقسیم اور شیعہ سنی کی تفریق ہمیں ایک قوم نہیں بننے دے گی۔ ان تفریقات کو ختم کر دیجیے۔ یاد رکھیئے:۔

ہماری کشتی کا لنگر اور ہماری عمارت کی بنیاد، اسلام ہے۔

(تقاریر جلد دوم صـ۸۹)

انہوں نے ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو، فرنٹیر مسلم لیگ کانفرنس، پشاور سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

(سوال یہ ہے کہ ہم جس آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اس کے حصول کے لیے ہمارے پاس قوت کونسی ہے۔ یہاں وہ قوت، ہمارا مذہب، ہماری ثقافت اور اسلامک آئیڈیلز ہے۔

(تقاریر جلد دوم صـ۳۳۸)

اسی کانفرس سے خطاب کے دوران آپ نے فرمایا:۔

مسلمان اس لئے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اس مملکت میں وہ اپنے ضابطۂ زندگی اپنے ثقافتی نشوونما اور روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

(تقاریر حصہ دوم صـ۳۳۳)

انہوں نے ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایڈورڈس کالج پشاور کے طلباء کے سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے کہا:۔

ہم، ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہمارا مذہب ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

بلکہ ہمارا کلچر بھی الگ الگ ہے۔ ہمارا مذہب ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات عطا کرتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ ہم اسی ضابطے کے آئیڈیلز کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، لیکن ہندو لیڈر شپ، رام راج قائم کرنا چاہتی اور اس راج میں مسلمانوں کو اقلیت کی پوزیشن دینا چاہتی ہے۔

(تقاریر حصہ دوم صـ۳۴۶)

آپ نے غور فرمایا کہ آیا یہ ہندو کا معاشی استحصال تھا جس نے ہمیں مطالبہ پاکستان پر مجبور کیا تھا یا اُن کا یہ منصوبہ کہ مسلمان، اسلام کے مطابق نہیں، بلکہ رام راج کے تابع زندگی بسر کریں! اس سلسلہ میں قائداعظمؒ نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس منعقدہ ۱۸ مارچ ۱۹۴۴ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

پاکستان کا مطالبہ اب کروڑوں مسلمانوں کے نزدیک جزوِ ایمان بن چکا ہے۔ یہ اب ایک نعرہ نہیں رہا۔ مسلمانوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ان کی حفاظت، نجات اور مقدر کا واحد ذریعہ پاکستان ہے وہ پاکستان کہ جب وہ وجود میں آگیا تو ساری دنیا میں یہ آواز گونج اٹھے گی کہ ہاں! اب ایک ایسی مسلم اسٹیٹ کا قیام عمل میں آگیا ہے جو اسلام کے ماضی کی درخشندہ عظمت و شوکت کا احیاء کرے گی۔

(تقاریر جلد دوم صـ۸۵)

یہاں قائداعظمؒ نے مملکت پاکستان کو وہ مسلم اسٹیٹ کہا ہے جو اسلام کے صدرِ اوّل کی عظمت و شوکت کا احیاء کرے گی۔

پاکستان کو اُس قسم کی اسلامی مملکت بننا تھا جس کا تصور علامہ اقبالؒ نے دیا تھا چنانچہ یوم اقبال منعقدہ دسمبر ۱۹۴۴ء کے سلسلہ میں پیغام دیتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا کہ:۔

اسلامی نظریاتِ زندگی پر یقین محکم رکھتے ہوئے، اقبال ان معدودے چند مشاہیر میں سے تھا جنہوں نے اس امکان کو روشن کیا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی حصوں میں، جو مسلمانوں کے تاریخی اماکن ہیں، ایک اسلامک اسٹیٹ قائم کی جا سکتی ہے۔

(تقاریر جلد دوم صـ۲۳۲)

قائداعظمؒ نے اس آواز کو، کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگی، ہندوستان کی چار دیواری تک ہی محدود نہیں رکھا۔ انہوں نے اسے مغربی ممالک تک میں عام کر دیا۔ انہوں نے ۸ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں بتایا:۔

پاکستان ایک مسلم اسٹیٹ ہوگی۔

(تقاریر جلد دوم صـ۲۳۶)

انہوں نے لندن، مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے ۱۴ دسمبر ۱۹۴۶ء کو فرمایا کہ:۔

ہم ایک ایسی آزاد مملکت چاہتے ہیں جس میں ہم اپنے تصوراتِ حیات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ (تقاریر جلد دوم صـ۵۰۳)

اب ملاحظہ فرمایئے قائداعظمؒ کا وہ ارشاد جس میں انہوں نے مسلمانانِ ہند کو واضح تر الفاظ میں بتا دیا کہ پاکستان کا حصول کیوں اشد ضروری ہے۔ انہوں نے ۱۰ مارچ ۱۹۴۱ء کو مسلم یونیورسٹی یونین علی گڑھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان نہ مٹ جائے تو اس کے لیے پاکستان، نہ صرف یہ کہ ایک عملی نصب العین ہے بلکہ یہی اور صرف یہی، واحد نصب العین ہے۔

(تقاریر جلد اول صـ۲۶۷)

قارئین گرامی، پاکستان بنانے والے قائداعظمؒ کے ان بیانات و فرمودات میں کہیں آپ کو وہ طرح مصرعہ بھی نظر آیا جو ہمارے دانشوروں کی نوک زبان پر رہتا ہے یعنی پاکستان کا حصول ہندوؤں کے معاشی استحصال کا نتیجہ تھا۔ پھر انہوں نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء کو پاکستان ڈے کی تقریب پر پیغام دیتے ہوئے کہا:۔

ہماری حفاظت، نجات اور عزت و آبرو (کے تحفظ کا واحد ذریعہ) پاکستان ہے۔ (یاد رکھو) اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو ہم تباہ ہو جائیں گے اور پھر اس برِصغیر میں مسلمانوں کا اور اسلام کا نشان تک باقی نہیں رہے گا۔

(تقاریر جلد دوم صـ۲۵۵)

یہ تو تھے پاکستان بننے سے قبل، تحریک حصول پاکستان کے دوران، ——— اس کے محرکات کے متعلق قائداعظم کے واضح اور دو ٹوک اعلانات۔ حصولِ پاکستان کے بعد

گورنر جنرل کی حیثیت سے، اکتوبر ۱۹۴۷ء میں خالقدینا ہال کراچی، میں افسروں سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا تھا کہ :۔

پاکستان کا قیام جس کے لیے ہم گذشتہ دس سال سے مسلسل کوششیں کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آچکا ہے۔ لیکن ہمارے لیے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں۔ اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما پا سکیں اور اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر رُو بہ عمل لائے جا سکیں۔

(گورنر جنرل کی حیثیت سے تقاریر کا مجموعہ صـ۲۲)

اس مقام پر اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جب قائداعظمؒ پاکستان کو اسلامی مملکت قرار دیتے تھے تو وہ اس خطرہ سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے جو اس مملکت کو "مذہب کے اجارہ داروں" کی طرف سے لاحق ہو سکتا تھا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے بہت پہلے وارننگ دی تھی۔ ۱۱۔ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں مسلم لیجسلیٹرز کنونشن کے آخری اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:۔

اسے اچھی طرح سمجھ لیجیئے کہ ہم کس مقصد کے لیے یہ لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین کیا ہے! یاد رکھیئے۔ ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں۔ ہم تھیاکریٹک اسٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔

(تقاریر جلد دوم صـ۳۸۶)

انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں اہل امریکہ کے نام اپنے براڈکاسٹ میں کہا:۔

پاکستان کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیہ اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، یہ مسلّمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی، جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ

(بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل صہ ۶۵)

یہی بات انہوں نے ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو اہل آسٹریلیا کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں بھی کہی تھی۔ ایضاً صہ ۵۸

یہاں سے یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ قائداعظمؒ پاکستان کو اسلامی مملکت بھی بنانا چاہتے تھے اور ساتھ ہی اس میں، زمام اقتدار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں بھی نہیں دینا چاہتے تھے۔ تو پھر وہ، اس اسلامی مملکت میں قانون کا سرچشمہ اور آخری اتھارٹی کسے قرار دینا چاہتے تھے؟ قائداعظمؒ نے اس باب میں بھی اپنے خیالات نہایت وضاحت سے بیان فرما دیئے تھے جو ہماری نئی نسل اور قدامت پرست دونوں طبقوں کے لیے دلیلِ راہ بننے کی حیثیت رکھتے ہیں انہیں غور سے پڑھیئے۔

آپ نے اگست ۱۹۴۱ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد (دکن) کے طلبا کے سوالات کے جواب میں فرمایا۔

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ، قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں، قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ (طلوع اسلام جولائی ۸۶ء)

اسی طرح اپریل ۱۹۴۳ء میں صوبہ سرحد کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے قائداعظمؒ سے ایک پیغام کیلئے درخواست کی۔ آپ نے جواب میں فرمایا:۔

> تم نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہیں کوئی پیغام دوں۔ میں تمہیں کیا پیغام دوں۔ جبکہ ہمارے پاس پہلے ہی ایک عظیم پیغام موجود ہے جو ہماری راہ نمائی اور بصیرت افروزی کے لیے کافی ہے۔ وہ پیغام ہے خدا کی کتاب عظیم، قرآن کریم۔ (تقاریر جلد اوّل صہ ۵۱۶)

اور ۱۳ نومبر ۱۹۴۵ء کو آپ نے قوم کے نام عید کا پیغام نشر فرمایا۔ اس زمانے میں ملک میں ہنگامے اور فسادات ہو رہے تھے۔ آپ نے قوم سے کہا کہ:۔

> جب ہمارے پاس قرآن کریم ایسی مشعلِ ہدایت موجود ہے تو پھر ہم اس کی روشنی میں ان

اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکتے۔

(تقاریر جلد اول صہ ۱۰۸)

دسمبر ۱۹۴۳ء میں کراچی میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا:۔

وہ کون سا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس اُمت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد خود ہی سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیا:۔

وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر، خدا کی کتابِ عظیم قرآنِ مجید ہے مجھے اُمید ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسول۔ فلہذا ایک قوم۔

(تقاریر جلد دوم صہ ۵۰

(کاش ہم نے اپنے قائدؒ کے ان فرمودات کو اپنی زندگی کا شعار بنایا ہوتا۔ اور اس طرح امت واحدہ بن گئے ہوتے۔)

یہ ہیں قارئین کرام! بانیٔ پاکستان حضرت قائداعظمؒ کے ارشادات کے مطابق حصولِ پاکستان کے محرکات اور حصولِ پاکستان کے بعد پاکستان کے آئین اور نظامِ حکومت کے متعلق ان کی بیان فرمودہ وضاحتیں۔ کیا آپ کو کہیں اُس راگ کی صدائے بازگشت بھی سنائی دی جسے ہمارے دانشور بیک زبان قوم کو سنائے چلے جا رہے ہیں۔؟

حصولِ پاکستان کا محرک، نظریۂ پاکستان تھا اور نظریۂ پاکستان کیا ہے اس کے متعلق بھی سن لیجئے۔

۱۔ قرآنِ کریم کی رُو سے معیارِ قومیت، حسب نسب، رنگ، خون، وطن یا مملکت کا اشتراک نہیں بلکہ ایمان کا اشتراک ہے۔ مسلمان، خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں بستے ہوں۔ ایک قوم کے افراد ہیں اور غیر مسلم، خواہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ایک ہی ملک میں کیوں نہ رہتے ہوں، دوسری قوم۔ اسے دو قومی نظریۂ (TWO NATION THEORY) کہا جاتا ہے۔

۲۔ اسلام، عقائد و عبادات اور شخصی قوانین ہی کا نام نہیں، یہ انسانی زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہے۔ اور جب تک زندگی کے ہر شعبے پر احکام و قوانین خداوندی کی حکمرانی نہ ہو، نہ مسلمان اپنے آپ کو آزاد تصور کر سکتا ہے، نہ قرآنی مومن اور قرآنی احکام و قوانینِ خداوندی کی حکمرانی کے لیے لامحالہ

آپ کو آزاد مملکت کی ضرورت ہے۔

یہ تھا نظریۂ پاکستان جس کو عملی شکل دینے کے لیے حصولِ پاکستان کی جنگ لڑی گئی اور پاکستان حاصل کیا گیا۔ اس میں ہندو کی تنگ نظری یا معاشی استحصال کو کوئی دخل نہ تھا بلکہ یہ ہمارے خدا اور رسول کی طرف سے مقرر فرمودہ ہمارے دین کا تقاضا تھا۔ اور ہے۔ کیونکہ اسلام کی رو سے مسلمان، صحیح اسلامی زندگی بسر کر نہیں سکتے جب تک اُن کی اپنی آزاد مملکت نہ ہو۔

قائداعظمؒ کے یہ ارشادات کہیں ڈھکے چھپے نہیں۔ ہزاروں لاکھوں کتابوں میں چھپ کر ہر جگہ دستیاب ہیں۔ ان کی موجودگی میں ان نظریات کو عام کرنا (جہاں سے ہم نے بات شروع کی تھی) ظلم نہیں تو اور کیا ہے اور خُدا کا قانون یہ ہے کہ

...... اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۶/۱۳۵

ہمارے دل میں رہ رہ کر یہ سوال اُبھرتا ہے کہ کیا کارپردازانِ حکومت پاکستان میں ایک رجلِ رشید بھی نہیں جو ذرائع ابلاغ سے ہونے والے اس مسلسل گمراہ کن پراپگینڈہ کو بند کر کے قوم کے سامنے حصولِ پاکستان کے بنیادی اور حقیقی محرکات کو بالاستمرار پیش کرتے رہنے کا ایک جامع منصوبہ بنا کر اُس پر عمل کرا سکے؟

کہ اس سے غفلت برتنے کے نتیجہ میں آنے والی تباہی میں ہم سب ہی غرق ہو جائیں گے۔ کوئی اُس تباہی سے یہ کہہ کر نہیں بچ سکے گا کہ میں نے نظریۂ پاکستان کے خلاف کچھ نہیں کہا تھا۔

..... اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝ ۱۱/۷۸

بقیہ: دین کی باتیں

لیکن نظام کو محسوس شکل پر قائم کرنے والا انسان ہوتا ہے۔

۳۹- اللہ اور رسولؐ وہ اصطلاح ہے جس کے صحیح مفہوم سے ساری اسلامی نظام کی صحیح شکل وصورت سامنے آئے گی اور مذہب میں اس کے غلط استعمال سے یہ سارا فساد و انتشار ہمارے سامنے ہے۔ جب تک اس کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آئے گا مسلمانوں کا کوئی متفق علیہ نظام نہیں بن سکے گا۔

۴۰- قرآن کی رو سے اللہ اور رسول کی اصطلاح کا مفہوم ہے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قوانین واصول پر مشتمل نظام جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً قائم کر کے اپنے پیچھے تمام آنے والے انسانوں کے لیے ایک ابدی مثال قائم کی۔

نظریۂ پاکستان کیا ہے؟

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ انسانوں کو قوتِ گویائی عطا کی گئی ہے وہ اپنے مقصد کا اظہار الفاظ میں کر سکتا ہے عَلَّمَهُ الْبَيَانَ خود خدا کا ارشاد ہے، انسان کی تمدنی زندگی کا دارومدار اسی خصوصیت پر ہے، لیکن یہ خصوصیت اسی صورت میں نعمت ہے کہ ہم جو لفظ بولیں، سننے والوں کے ذہن میں اس کا مفہوم متعین ہو، اگر ایسا نہ ہو اور ایک ہی لفظ کے معانی مختلف افراد مختلف لیں تو اس سے زندگی اجیرن ہو جائے، مثلاً آپ اس ماجرا پر غور فرمائیں کہ آپ نیم بیہوشی کے عالم میں شدّت پیاس سے کہیں — پانی — اور آپ کے گھر والوں میں سے کوئی ماچس کی ڈبیا لیے چلا آرہا ہو اور کوئی لالٹین، ایک آپ کے سرہانے تولیہ لئے کھڑا ہو اور دوسرا بالٹی۔ کسی کے ہاتھ میں تیل کی شیشی ہو اور کوئی آپ کا جوتا تلاش کر رہا ہو ——— سوچیئے کہ اگر صورت یہ ہو تو خدا کی یہ نعمت (قوت گویائی) کس قدر عذاب بن جائے، یہ نعمت اسی صورت میں قرار پائے گی کہ جب آپ "پانی" کہیں، تو ہر سننے والا اس سے "پانی" مراد لے۔

یہ مثال تو زندگی کے عام معمولات سے متعلق ہے۔ اسے ذرا آگے بڑھایئے اور سوچیئے کہ آپ اہم مسائلِ حیات کے متعلق جو الفاظ یا اصطلاحات استعمال کریں، اگر سننے والوں کے نزدیک ان کا متعین مفہوم نہ ہو، تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اسے سمجھنے کے لیے آپ خود اپنی تاریخ پر ایک نظر ڈالئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے ایک نظامِ حیات پیش کیا ہے جسے اِسلام کی اصطلاح سے تعبیر کیا۔ اس کا مفہوم اس قدر واضح اور متعین تھا کہ موافق، مخالف، ہر ایک سمجھتا تھا کہ اس سے مراد کیا ہے لیکن اس سے ذرا آگے چل کر ہمارے سامنے یہ نقشہ آتا ہے کہ ہر شخص کی زبان پر اسلام ہے، لیکن ہر شخص کے نزدیک اسکا مفہوم جداگانہ ہے، اس کا نتیجہ یہ کہ وہی قوم جو اس اصطلاح کے متعین مفہوم سے اُمّتِ واحدہ تھی، فرقوں میں بٹ گئی، اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی، تاریخ میں مسلمانوں کے سینکڑوں فرقوں کا تذکرہ آپ کے سامنے

اسلام کا جداگانہ مفہوم

آئے گا۔ لیکن ان میں کوئی ایک فرقہ بھی ایسا نہیں ملے گا جس نے یہ کہا ہو کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر کسی اور دین کی دعوت دے رہا ہے۔ ہر ایک اسلام کی طرف دعوت دینے کا مدعی تھا، اور ہر فرقہ دوسرے کے دعوے کی تکذیب کرتا تھا، ماضی کو چھوڑیئے اور حال کی طرف آیئے، آج بھی مسلمانوں میں بیسیوں فرقے ہیں اور ان سب کا دعویٰ یہی ہے کہ وہ اسلام پر قائم ہیں۔ اور اسی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اس کے باوجود ہر فرقہ اپنے آپ کو اسلام کا علمبردار قرار دیتا ہے اور دوسروں کے اسلام کو کفر بتاتا ہے اور کوئی شخص اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کس کا دعوے اسلام سچا ہے اور کس کا جھوٹا ہے، اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس اصطلاح کا کوئی متعین مفہوم سامنے نہیں۔ ان اصطلاحات کے مفہوم کے عدم تعین کا مظاہرہ ہم منیر کمیٹی کی روئیداد میں دیکھ سکتے ہیں، انہوں نے پاکستان کے علمائے کرام سے کہا کہ وہ بتائیں کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ یعنی اس اصطلاح کا مفہوم کیا ہے؟ ان میں سے اکثر و بیشتر تو اس کا سرے سے کوئی جواب ہی نہ دے سکے، اور جنہوں نے جواب دیا، ان میں سے کسی کا جواب دوسرے کے جواب سے ملتا نہیں تھا، ان بنیادی اصطلاحات کے مفہوم کے عدم تعین کا نتیجہ ہے کہ قوم اس قدر تشتت و انتشار، اور فساد و خلفشار کا شکار ہو رہی ہے، ہر ایک کی زبان پر لفظ اسلام کا ہے لیکن ہر ایک کا راستہ جدا جدا اور منزل الگ الگ ہے، قرآن کریم نے تفرقہ کو جو شرک قرار دیا ہے (۳۰/۳۲) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ مسلمانوں کے مختلف گروہ خدا کے ساتھ بتوں کو پوجنے لگ گئے ہیں، توحید کے معنی ہیں ساری قوم کے سامنے ایک نصب العین (جو خدا کا متعین کردہ ہو) اور شرک سے مراد ہے ہر گروہ کا الگ الگ نصب العین یعنی اسلام کا اپنا اپنا مفہوم!

تشتت و انتشار کے عذاب میں گرفتار قوم کی ایک خرابی یہ بھی ہوتی ہے۔ کہ اگر وہ کبھی ان خرابیوں کے ازالہ کی فکر کرے تو بجائے اس کے کہ ان خرابیوں کے علل و اسباب پر غور کر کے انہیں دور کرنے کی کوشش کرے، وہ ان میں ایک اور خرابی کا اضافہ کر لیتی ہے — جیسے فرقہ بندی کی خرابیوں کو دور کرنے کے خیال سے اٹھنے والا، ایک نیا فرقہ بنا کر بیٹھ جاتا ہے، اور پارٹیوں کے پھیلائے ہوئے فسادات کو مٹانے کا دعویدار ان میں ایک اور پارٹی کا اضافہ کر دیتا ہے، چنانچہ لفظ اسلام کے مفہوم کے عدم تعین سے گھبرا کر قوم نے بجائے اس کے کہ وہ اس اصطلاح کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کرے اب ان اصطلاحات میں ایک اور اصطلاح کا اضافہ کر لیا ہے، اور وہ اصطلاح ہے

نظریۂ پاکستان کی اصطلاح

-نظریۂ پاکستان — اس جدید اصطلاح کو وضع کئے (یا اختیار کئے) کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اس کے بھی اتنے ہی

مفہوم ہو گئے ہیں، جتنے مفاہیم لفظ اسلام کے تھے، اب ہر پارٹی نظریۂ پاکستان کے تحفظ کی مدعی ہے۔ اور ہر پارٹی دوسری پارٹی سے، اس بنا پر برسرِ پیکار کہ نظریہ پاکستان کے حامل ہم ہیں، فریقِ مخالف نہیں۔ آیئے ہم دیکھیں، کہ اس اصطلاح کا مفہوم کیا ہے۔

پولیٹیکل سائنس (علم السیاسیات) کی رُو سے مملکت (STATE) سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ ایک خطۂ زمین میں بسنے والے افراد، ایک ہیئت اجتماعیہ (انفرادی کے بجائے اجتماعی زندگی بسر کرنے) کا تہیّہ کر کے، ایسا نظم ونسق قائم کریں، جس سے وہ ملک مستحکم ہو اور اس کے باشندے خوش حال اور ہر قسم کے خطرات سے مامون — اس مملکت کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ افراد مملکت کا تصورِ زندگی کیا ہے۔ اور نظریات ومعتقدات کس قسم کے، یہ افراد کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے، اس قسم کی مملکت کو قومی یا وطنی مملکت کہا جاتا ہے، اس کے برعکس مملکت کا ایک تصور قرآن نے دیا تھا۔ اور وہ یہ کہ ایک قسم کا نظریۂ حیات اور فلسفۂ زندگی رکھنے والے افراد، اپنی منفرد ہیئتِ اجتماعیہ متشکل کرنے کا فیصلہ اور عزم کریں (ہمارے زمانے میں کمیونزم کے حاملین نے اس تصورِ مملکت کو اپنایا ہے) ہندوستان کی تحریک آزادی میں ہندوؤں کے پیشِ نظر ایک قومی یا وطنی مملکت کا قیام تھا، اس کے برعکس، تحریک پاکستان کے پیشِ نظر اس قسم کی مملکت کا قیام تھا، جس کا تصور قرآن نے دیا تھا اس کا صحیح نام تو قرآنی مملکت تھا، لیکن غیر مسلموں کو سمجھانے کے لیے (نیز اسے تھیاکریٹک سٹیٹ سے متمیز کرنے کے لیے) پہلے علامہ اقبالؒ نے اور اس کے بعد قائداعظمؒ نے اسے نظریاتی مملکت (IDEOLOGICAL STATE) کہہ کر پکارا — یعنی وہ مملکت جس کی بنیاد ایک خاص نظریۂ حیات (IDEOLOGY) پر ہوگی، اسی سے نظریۂ پاکستان (IDEOLOGY OF PAKISTAN) کی اصطلاح وجود میں آئی، یعنی ایسی مملکت جو میرے، آپ کے، یا ہندوستان میں بسنے والے افراد کی اکثریت کے، یا وہاں کی پوری کی پوری آبادی کے، ذاتی خیالات، یا مقاصد کے مطابق متشکل نہیں ہوگی، بلکہ قرآنی اقدار کے فروغ اور برومندی کے لیے وجود میں لائی جائے گی۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک نقطہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ میں ان مقامات میں، اسلام، کی جگہ "قرآن" کا لفظ استعمال کر رہا ہوں، میں ایسا عمداً کر رہا ہوں، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے (اور جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے) لفظ اسلام کا مروجہ مفہوم، متعیّن نہیں رہا، اس لیے جب اس لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے تو کسی کے سامنے نہ کوئی متعیّن مفہوم آتا ہے اور نہ اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معانی

لفظ اسلام کے بجائے قرآن

متعین کرنے کے لیے کس طرف رجوع کیا جائے، اس کے برعکس جب لفظ "قرآن" استعمال کیا جائے تو اس سے ہر ایک کی نگاہ ایک خاص کتاب کی طرف اٹھتی ہے۔ جس کے متعلق ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ وہ خدا کی عطا کردہ ہے اور ہمارے لیے ابدی راہنمائی کا ذریعہ، لہٰذا، اس ذہنی خلفشار اور نظری انتشار کے عالم میں "قرآن" کے لفظ سے کم از کم توجہات ایک مرکز پر تو مرکوز ہو جاتی ہیں، یہ وجہ ہے کہ میں اسلام کے بجائے قرآن کا لفظ استعمال کیا کرتا ہوں، ورنہ اگر صدر اول کی طرح اسلام کا متعین مفہوم ہمارے سامنے ہوتا تو اسلام اور قرآن کے الفاظ کا عملاً مفہوم ایک ہی ہوتا۔ اسلام اس نہج زندگی کا نام ہے جو قرآن کے مطابق بسر کی جائے، یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن ❊ نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

چونکہ گروہ بندانہ مفاد کا تقاضا یہ ہوتا ہے (خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو اور خواہ سیاسی پارٹیوں کی صورت میں) کہ قوم کے سامنے، اس کے نظریۂ حیات اور نصب العین زندگی کے متعلق کوئی متفق علیہ اور متعین مفہوم نہ آنے پائے، اس لیے قرآن کا نام سامنے لانے سے ان کی طرف سے یہ اعتراض وارد

اس پر اعتراض

کر دیا جاتا ہے کہ قرآن بے شک ایک متعین کتاب کا نام ہے لیکن اس کتاب کا مفہوم تو متعین نہیں، اس کی تعبیر الگ الگ کی جاتی ہے لہٰذا، اس سے بھی انتشار اور خلفشار کی وہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو لفظ "اسلام" سے پیدا ہوتی ہے، اس سلسلے میں سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ (انسانی تصانیف میں بھی) ایک عمدہ کتاب کی بنیادی خوبی یہ قرار دی جاتی ہے کہ وہ اپنے مفہوم کو واضح اور متعین طور پر سامنے لائے، اگر کوئی تحریر ایسے الفاظ میں منضبط ہو کہ وہ ہر شخص کو، اسکی منشاء کے مطابق (الگ الگ) معانی دیدے، تو وہ کتاب اٹھا کر پھینک دینے کے قابل سمجھی جائے گی، جب انسانی تصانیف کے عمدہ ہونے کا معیار یہ ہے تو ایک ایسی کتاب جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ وہ کسی انسان کی نہیں بلکہ انسانوں سے بلند و بالا خود خدا کی تصنیف ہے، کیا اس کی کیفیت یہ ہوگی کہ اس کے الفاظ مختلف اور متضاد معانی دینے کے قابل (CAPABLE) ہوں، بالخصوص جب اس کا دعویٰ یہ ہو کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں — اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (۴/۸۲) — کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے؟ اگر یہ کتاب خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتی تو اس میں بہت سے اختلافات پائے جاتے — سوچئے کہ جس کتاب کا بنیادی دعویٰ یہ ہو، کیا اس کی کیفیت یہی ہوگی کہ وہ ہر ایک کو الگ الگ تعلیم دے؟

دوسری بات یہ سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن عظیم کی تعلیم کا ایک حصہ وہ ہے، جس میں اس نے انسانی زندگی

آیاتِ محکمات و متشابہات

کے لیے راہ نمائی دی ہے۔ انہیں اصولِ حیات یا مستقل اقدار کہا جائے گا۔ یہ اصول و اقدار بالکل واضح اور متعین ہیں اور ان کے سمجھنے میں کوئی اختلاف نہیں پیدا ہو سکتا۔ امورِ مملکت کا تعلق اسی گوشہ سے ہے، قرآنی تعلیم کا دوسرا گوشہ وہ ہے جس کا تعلق حقائقِ کائنات اور مابعد الطبیعاتی مسائل (METAPHYSICS) سے ہے، ان حقائق کے سمجھنے کا مدار، انفرادی فکر اور بہ ہیئتِ مجموعی انسانی علم کی سطح پر ہے، جوں جوں انسانی علم کی سطح بلند ہوتی جائے گی، یہ حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے اور کوئی شخص جس قدر زیادہ غور و فکر سے کام لے گا۔ وہ انہیں اسی قدر زیادہ عمدگی سے سمجھ سکے گا۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ:۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ۭ وَهُوَ عَلٰي جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَاۗءُ قَدِيْرٌ (۴۲/۲۹)

اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے، کہ اس نے ارض و سمٰوٰت (زمین اور دیگر اجرامِ فلکی) کو پیدا کیا۔ اور ان میں ذی حیات کو پھیلا دیا اور وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق زمین اور ان اجرام کے ذی حیات کو اکٹھا کر دے۔

ظاہر ہے کہ اس آیت کا مفہوم آج سے کچھ عرصہ پہلے کچھ اور لیا جاتا تھا اور آج (بالخصوص تسخیرِ قمر کے بعد) اس کا مفہوم واضح ہوتا چلا جا رہا ہے اور جس دن کسی اور کرّہ کے ذی حیات (خواہ وہ جراثیم ہی کیوں نہ ہوں) زمین پر لائے جائیں گے تو اس آیت کا مفہوم متعین ہو جائے گا۔ اسی قسم کے حقائق ہیں، جن کا صحیح مفہوم سامنے آنے کے سلسلہ میں فرمایا کہ:۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)

ہم انہیں، خارجی کائنات اور خود ان کی اپنی دنیا میں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے، تا آنکہ یہ بات واضح طور پر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن جو کچھ کہتا ہے، وہ حقیقت پر مبنی ہے۔

یوں ان حقائق کا مفہوم متعین ہوتا جائے گا اور ظاہر ہے "ان نشانیوں کے بے نقاب" ہونے کے بعد بھی، ان کا مفہوم، ہر شخص کی علمی اور فکری استعداد کے مطابق اس کی سمجھ میں آئے گا۔ اس کے لیے (عربی زبان سے واقف ہونا بے شک ضروری ہوگا، لیکن محض اس زبان سے واقف ہونا کافی نہیں ہو گا۔ آج کتنے لوگ ہیں، جو انگریزی زبان کا علم رکھنے کے باوجود، آئن سٹائن کی اصطلاح (RELATIVITY) کا صحیح مفہوم سمجھ سکنے کے قابل ہیں!

لیکن یہ شرائط، بسیط حقائق کے مفہوم سے متعلق ہیں، جہاں تک انسانی زندگی کی راہ نمائی اور

امورِ مملکت کا تعلق ہے، قرآنی اصول و اقدار کا مفہوم متعیّن اور واضح ہے، جب وہ اسلامی مملکت کے متعلق کہتا کہ — وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے — تو فرمایئے کہ اس کا مفہوم سمجھنے میں کس قسم کا الجھاؤ یا اختلاف پیدا ہو سکتا ہے؟ (یاد رکھیئے، قرآن اصول دیتا ہے، ان اصولوں کو، بروئے کار لانے کا پروگرام، ہر دور کی قرآنی مملکت خود متعیّن کرتی ہے)۔

لہٰذا، اگر نظریہ پاکستان (یا اسلامی مملکت کے اصول و مبانی) کا تعیّن قرآنِ کریم کی رو سے کیا جائے تو اس کے مفہوم میں نہ کوئی الجھاؤ یا ابہام رہ سکتا ہے، نہ اختلاف یا تضاد پیدا ہو سکتا۔

قرآن کریم کی رُو سے، اسلامی مملکت کی بنیاد اس حقیقتِ کبریٰ پر ہے کہ اس میں کوئی شخص نہ کسی دوسرے شخص کا محکوم ہوتا ہے نہ محتاج۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

کس در این جا سائل و محروم نیست ، عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اس میں حکومت صرف خدا کی ہوتی ہے، لیکن یہ اصول، وضاحت طلب ہے، ظاہر ہے کہ خدا خود حکومت کرنے کے لیے سامنے نہیں آتا۔ اس لیے خدا کی حکومت کس طرح قائم ہوگی؟ ایک حکومت تو شخصی ہوتی ہے، یعنی

خدا کی حکومت کا مطلب

مملکت کا پورا اقتدار ایک شخص کے ہاتھ میں ہوتا ہے، وہ جو حکم دے، اس کی اطاعت ضروری ہوتی ہے۔ اس کی مملکت میں نہ کوئی شخص یہ جان سکتا ہے کہ اس (صاحبِ حکومت) نے کل کو کیا حکم دے دینا ہے، نہ کسی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے وہ حکم کیوں دیا ہے، اس اندازِ حکومت کو ملوکیت کہا جاتا ہے، قرآن اس قسم کی حکومت قائم نہیں کرنا چاہتا اس لیے "خدا کی حکومت" بھی ملوکیت کے انداز کی نہیں ہوتی۔

دوسرا اسلوبِ حکومت یہ ہے کہ اطاعت قوانین کی ہو اور قوانین کی غرض و غایت اور علّت و حکمت کا ہر ایک کو علم ہو — قرآن اسی نہج کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے، اس مقصد کے لیے، خدا نے ایک ضابطہ قوانین دے دیا ہے، جس میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے، کہ ان قوانین کی حکمت اور غایت کیا ہے۔ اس ضابطہ قوانین (قرآن) کی اطاعت کا نام خدا کی محکومیت ہے، اور یہی مومن اور کافر کا امتیازی نشان ہے، قرآن میں ہے

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (۵/۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے تو یہی لوگ کافر ہیں

اور اس کے بعد، خود رسول اللہ سے ارشاد ہوا کہ:-

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ۔ (۵/۴۸)

(اے رسولؐ!) تو ان لوگوں میں کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کر (ان کے معاملات کے فیصلے اس کے مطابق کر) جب یہ کتاب والحق تمہارے پاس آچکی ہے تو پھر انسانوں کے خیالات اور آراء کا اتباع کیوں کیا جائے!

یہ ہے خدا کی حکومت قائم کرنے (یا اس محکومیت اختیار کرنے) کا عملی طریقہ، یعنی قرآنی اصول و اقدار کو حکومت کا آئین قرار دینا اور اس کے قوانین و ضوابط کو ملک میں نافذ کرنا، یہ وہ بنیادی حقیقت تھی جس کا اظہار قائداعظمؒ نے ان الفاظ میں کیا تھا جو نظریہ پاکستان کا مفہوم متعین کرتے ہیں، اور جس مقصد کے لیے انہوں نے حصولِ پاکستان کے لیے اس قدر جدوجہد کی تھی، یہ الفاظ انہوں نے ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد (دکن) میں، عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کے سوال کے جواب میں ارشاد فرمائے تھے، اور ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا نے انہیں نشر کیا تھا، اور (علاوہ دیگر اخبارات) انقلاب (لاہور) نے انہیں چھاپا تھا۔ الفاظ یہ تھے۔

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے۔ کہ اس میں اطاعت صرف خدا کی ہوتی ہے۔ جس کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام و اصول ہیں اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی، قرآن مجید کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں، اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے، اور حکمرانی کے لیے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

یہ ہے نظریۂ پاکستان یعنی حکومت کا حق خدا کے سوا کسی کو نہیں، اور اس کی عملی شکل یہ ہے، کہ مملکت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود خدا کی کتاب کے اصول و احکام کی رُو سے متعین ہوں بالفاظِ دیگر، نظریۂ پاکستان سے مراد ہے قرآن کی حکمرانی۔

نظریہ کا لفظ

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لیے "نظریہ" کا لفظ بھی موزوں نہیں، اس لئے کہ ہمارے ہاں نظریہ انگریزی زبان کے لفظ (THEORY)[1] کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، جو عمل ـــــ (PRACTICE) کے بالمقابل ہوتا ہے، حتیٰ کہ نظری مسائل کہا ہی ان مسائل کو جاتا ہے جن کے متعلق محض لفظی بحث ہوتی رہے اور وہ عمل میں نہ لائے جائیں ـــــ

---

[1] قائداعظمؒ نے بھی (THEORY OF PAKISTAN) کی اصطلاح استعمال کی تھی، مثلاً انہوں نے ۸ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے وقت یہی الفاظ استعمال کئے تھے، لیکن یہ اس لیے کہ انگریزی زبان میں اس مفہوم کیلئے (THEORY) یا (IDEOLOGY) کے الفاظ ہی مستعمل ہیں۔

علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ :-

میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا ؛ مسائل نظری میں اُلجھ گیا ہے خطیب!

وہ (ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں) اس قسم کے مسائل کو "الٰہیات کے تراشے ہوئے لات ومنات" کہہ کر پکارتے ہیں اور انہیں امت کی تباہی کا بنیادی سبب قرار دیتے ہیں، اصل یہ ہے کہ نظریہ (THEORY) کی طرح آئیڈیالوجی کا لفظ بھی کچھ زیادہ وزنی نہیں سمجھا جاتا، اس کے متعلق بھی ذہن میں یہی آتا ہے کہ ایک تخیلاتی سا تصور ہے جو عمل میں نہیں آسکتا، چنانچہ (IDEALIST) کہا ہی اسے جاتا ہے جس کی یہ کیفیت ہو کہ — افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار — اقبالؒ نے جب (۱۹۳۰ء میں) پاکستان کا تصور پیش کیا تھا، تو سیاسیین نے اسے یہ کہہ کر ناقابلِ اعتنا قرار دے دیا تھا کہ یہ محض ایک شاعر کا خواب ہے، جس کا دنیائے ممکنات سے کوئی تعلق نہیں، خود مغرب میں بھی (IDEALISTS) کا لفظ، تصورات کی دنیا میں بسنے والوں کے لیے استعمال ہوتا تھا، قرآن نے اس کے لیے "کلمۃ اللہ" کی اصطلاح دی ہے، اس کے معنی ہیں ایسا بنیادی اصول جس میں نشوونما پاکر محسوس پیکر اختیار کر لینے کی صلاحیت

کلمۃ اللہ

ہو چنانچہ جب بدر کے میدان میں کفر اور اسلام کا پہلا عملی تصادم ہوا ہے، تو اس کی غرض و غایت کے متعلق کہا۔ وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔ (۹/۴۰) تاکہ ان لوگوں کا کلمہ جنہوں نے صداقت سے انکار و سرکشی کی راہ اختیار کی ہے مغلوب ہو، اور خدا کا کلمہ غالب آجائے اس لیے کہ یہ کلمہ وہ ہے جو حکمت اور قوت پر مبنی ہے، یہی وہ کلمہ ہے جسے سورۃ ابراہیم میں ایک مثال کے ذریعہ یوں سمجھایا گیا ہے کہ — كَلِمَةً طَيِّبَةً کی مثال یوں سمجھو — كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (۱۴/۲۴) اس پھلنے پھولنے والے درخت کی طرح جس کی جڑیں محکم ہوں اور جس کی شاخیں آسمان کی بلندیوں میں جھولے جھول رہی ہوں، تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا (۱۴/۲۵) اور وہ قانون خداوندی کے مطابق ہر موسم میں پھل دے، آپ نے غور فرمایا کہ یہاں اللہ کی کیا خصوصیات بتائی گئی ہیں، وہ نہایت مضبوط جڑوں والا تناور درخت، جو ہمیشہ اپنا پھل دیتا رہتا ہے، یعنی وہ محض ایک نظری مسئلہ یا تخیلاتی تصور نہیں، وہ ایک ایسا فارمولا ہے جو عمل میں لایا جاتا ہے تو اس کے دعویٰ کی صداقت اس کے محسوس نتائج سے سامنے آجاتی ہے اس کے برعکس كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ (۱۴/۲۶) ہے جس کی کیفیت اس پودے کی سی ہے جس کی جڑیں زمین کے اوپر ہی اوپر ہوں اور ہوا کے ذرا سے تیز جھونکے سے اکھڑ جائیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، قرآن کریم نے دین کی اساس و بنیاد اس حقیقت کو قرار دیا ہے۔

کہ حق حکومت خدا کے سوا کسی کو نہیں اس حقیقت کے اظہار کے لیے اس نے ایک جامع فقرہ استعمال کیا ہے اور وہ یہ ہے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ دنیا میں کوئی ہستی (شخص، گروہ یا ادارہ) ایسی نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے بجز اللہ کے، محکومیت صرف خُدا کی (اختیار کی جا سکتی ہے "حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری" اس انقلاب انگیز اساسی پیغام کا جو ترجمہ آج کل کیا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ دنیا میں شے یا ہستی پرستش کے قابل نہیں سوائے اللہ کے، تو یہ تصور اُس دور کا پیدا کردہ ہے جب اسلام کو دین کی سطح سے اتار کر مذہب کی سطح پر لا کھڑا کر دیا تھا دین میں اللہ سے مراد، صاحبِ اقتدار و اختیار ہوتا ہے، مذہب میں اس کا مفہوم "پرستش کی شے" ہو جاتا ہے، اسلام کا اساسی اصول لا الٰہ الا اللہ کے مختصر، لیکن بے حد جامع الفاظ میں مرتکز ہے اور اسی کو کلمہ یا کلمہ طیبہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جب دین میں اسے کلمہ کہا گیا تھا تو اس سے جو عملی نقشہ سامنے آتا تھا، اس کے متعلق قرآنی تصریحات اوپر پیش کی جا چکی ہیں، لیکن اس کے بعد یہی کلمہ، ایک رسم بن کر رہ گیا، یا زیادہ سے زیادہ علم الکلام کا ایک مسئلہ (یا اہل تصوف کا سرِ باطن، جنہوں نے وحدت الوجود، کے فلسفہ کی رُو سے اس کے معنی یہ کر دیئے کہ دنیا میں کوئی معبود ایسا نہیں جو خود خدا نہ ہو، یعنی انسانوں نے جتنے معبود تراش رکھے ہیں وہ سب خدا ہی کی مختلف شکلیں ہیں، معاذ اللہ، معاذ اللہ) بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن نے اسلامی مملکت کے اساسی اصول کو لا الٰہ الا اللہ کے کلمہ سے تعبیر کیا ہے، اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ قرآن مجید کے احکام اصول و اقتدار کو حاصل ہوگا۔

لیکن ہمارے ہاں، جو حضرات اسلامی حکومت کے قیام اور نظریہ پاکستان کے تحفظ کے مدعی ہیں (اور آج کون ہے جو اس کا مدعی نہیں؟) ان میں سے کوئی بھی اس اساس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں، اس لیے کہ اس اساس پر اُمتِ واحدہ کی عمارت استوار ہوتی ہے جس میں نہ مذہبی فرقوں کی کوئی گنجائش ہوتی ہے نہ سیاسی پارٹیوں کے لیے کوئی جگہ —— نہ جغرافیائی حدود کی بنا پر علاقائی تفریق روا رکھی جا سکتی ہے اور نہ نسلی امتیاز کی بنا پر کوئی تمیز اس میں، ساری کی ساری اُمت، غیر مسلموں کے مقابلہ میں ایک پارٹی (حزب اللہ) ہوتی ہے، جس کے اندر فرقہ سازی، یا پارٹی بازی، یا اسی قسم کی کوئی اور تفریق، شرک سمجھی جاتی اور حکمتِ فرعونی قرار پاتی ہے (۲۸/۴) یہ وجہ ہے کہ یہ حضرات (لفظ اسلام کی طرح) "نظریہ پاکستان" کے الفاظ کو تو اس شد و مد سے دہراتے رہتے ہیں، لیکن اس کا متعین مفہوم کبھی پیش نہیں کرتے، فرقہ بندیوں اور پارٹی بازیوں میں الجھی اور کھوئی ہوئی قوم، توحید خالص کی طرف آنا ہی نہیں چاہتی، قرآن کے الفاظ میں۔ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَحْدَہُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِیْنَ لَا

يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ۔ (۳۹/۴۵) ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب ان لوگوں کے سامنے، جو آخرت کے منکر ہیں، خدائے واحد کا تصور پیش کیا جاتا ہے تو وہ سخت کبیدہ خاطر ہو جاتے ہیں، اور جب خدا کے علاوہ، اوروں کا ذکر کیا جائے تو وہ ہشاش بشاش ہو جاتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے کہ اہل جہنم سے کہا جائے گا کہ إِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ۔ وَإِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا۔ جب تمہیں خدائے واحد کی طرف دعوت دی جاتی تھی تو تم اس سے انکار کرتے تھے، اور جب اس کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کیا جاتا تھا، تو تم اس اسلوبِ حکومت کو صحیح تسلیم کر لیتے تھے، حالانکہ حقیقت یہ تھی (اور ہے) کہ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ۔ (۴۰/۱۲) حکومت صرف خدا کی ہو سکتی ہے، وہی علو اور کبریائی کا مالک ہے، سورہ بنی اسرائیل میں ہے، إِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى أَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا۔ (۱۷/۴۶) جب تو قرآن میں خدائے واحد کا ذکر کرتا ہے تو یہ لوگ نفرت آگیں انداز سے منہ موڑ کر چل دیتے ہیں، چنانچہ آج بھی کیفیت یہ ہے کہ خدائے واحد (یعنی قرآنِ خالص) کی حکمرانی کو نہ ہمارا مذہب پرست حلقہ گوارا کرتا ہے نہ مغرب زدہ طبقہ۔ "نہ دیر میں، نہ حرم میں خودی کی بیداری"! کیونکہ اس سے ان کے مفادات پر زد پڑتی ہے اور ان کے فرقے اور پارٹیاں باقی نہیں رہتیں، لیکن ان میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ یہ اپنے اس شرک کا اعلان یا اعتراف کریں، اس کے لیے انہوں نے ٹیکنیک یہ اختیار کر رکھی ہے، کہ اسلام یا نظریۂ پاکستان جیسی اصطلاحات کا مفہوم متعین نہ کیا جائے، انہیں مبہم رکھا جائے۔

ہمارے ہاں یہ شعر جو زبانِ زدِ خلائق ہے کہ:۔

پاکستان کا مطلب کیا ـــــ لا الٰہ الا اللہ!

معلوم نہیں کہنے والے کے سامنے اس کا وہ مفہوم تھا یا نہیں جو قرآن کریم کی رو سے، اوپر بیان کیا گیا ہے۔ لیکن بات اس نے پتہ کی کہی تھی۔ حقیقت یہی ہے کہ پاکستان یا اسلامی مملکت کی اساس، لا الٰہ الا اللہ، اور اس سے مراد ہے خدا کی کتاب (قرآن مجید) کی حکمرانی۔ اگر بایں نرسیدی تمام بولہبی است۔ یہی نظریۂ پاکستان سے مراد ہے۔:

ضروری تصحیح

طلوع اسلام بابت جون ۱۹۸۷ء میں شائع شدہ مضمون "صلۂ شہید کیا ہے تب و تابِ جاودانہ" کے صاحبِ مضمون کا صحیح پتہ یہ ہے: اے۔کے۔ کے سردری۔ اسسٹنٹ سیکرٹری
یوگنڈا انٹینل ایگزامینیشن بورڈ۔ یوگنڈا

ثریا عندلیب

دین کی باتیں

۱- دماغ انسان کے اعمال کے لیے محرک نہیں بنتا۔ یہ انسان کے جذبات ہیں جو اعمال کے لیے محرک بنتے ہیں۔ اگر دماغ کے ساتھ دل ہم نوا نہیں تو بیکار ہے۔

۲- ایمان کا دل کی گہرائیوں میں اترنے کا ثبوت یہ ہے کہ ایمان لانے والا کس حد تک قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتا ہے۔ محض زبانی طور پر چند الفاظ دہرا لینے سے مومن نہیں ہو سکتے۔

۳- مذہب میں ہدایات وعظ کی شکل میں ہوتی ہیں۔ ڈبیوں پر سگرٹ زہر ہے، لکھنے سے مذہبی فریضہ پورا ہو جاتا ہے۔ دین وعظ نہیں وہ حکماً روکتا ہے۔ حکماً کرواتا ہے۔

۴- کوئی انسانی بچہ نہ مومن پیدا ہوتا ہے نہ کافر پیدا ہوتا ہے۔ اسے مومن یا کافر خود بننا پڑتا ہے۔ فہم و شعور آنے کے بعد قرآن اسی لیے فعل کے صیغے لایا ہے۔

۵- قرآن کا نظامِ عدل ملزم کو مجرم قرار نہیں دیتا، جب تک تحقیق نہ ہو۔ پہلا ردِّ عمل ملزم کے حق میں خیر کا ہونا چاہیے شر کا نہیں۔

۶- اطمینان اور خود فریبی میں بڑا فرق ہوتا ہے ایسا فرق جو فطری نیند اور افیم کھا کے لائی ہوئی نیند میں ہے

۷- ہمیں یہ عادت ہو گئی ہے کہ اپنی ذمہ داری کسی دوسرے کے سر پر رکھ دیں یا رب خود کریں اور لعنت بھیجیں شیطان پر اگر وعدہ کر کے ایفا نہ کرنا ہوا تو انشا اللہ کہا اور ذمہ داری خدا پر ڈال دی جبکہ انشاء اللہ کے معنی یہ ہیں کہ چونکہ میں نے خدا کے قانون کے مطابق کہا ہے اس لیے یہ ہو کر رہے گا یہ یقینی بات ہے۔

۸- ایمان اور اعمال صالحہ کی بنا پر جو مملکت قائم ہوتی ہے اس کے نتائج حسنہ کو قرآن اس دنیا میں جنّت سے معنون کرتا ہے۔

۹- مذہب کی دنیا میں سب سے بڑا جرم قرآن میں تدبّر کرنا ہے۔

۱۰- انسان کا سب سے بڑا مسئلہ روٹی کا، رزق کا معاش کا مسئلہ ہے۔ دنیا کے صاحب اقتدار رزق کے سرچشموں پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ انہوں نے یہ قبضہ کیا اور ہر شخص ان کے سامنے جھک گیا۔

۱۱۔ جب خدا کے نظام کے تابع رزق کی تقسیم ہوتی ہے تو پھر انسان کسی کے سامنے نہیں جھکتا۔

۱۲۔ استقامت کی ضرورت اس ٹکراؤ میں ہوتی ہے جب رزق پر قابض لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔

۱۳۔ اتباع میں خارج سے حکم نہیں آتا۔ دل کے ارادے کے لیے خارج کا حکم نہیں ہوتا۔ یہ بات کہ مجھے پارسا رہنا چاہیے۔ یہ آپ اپنے اندر کی آواز سے طے کرتے ہیں۔ جب آپ کو پیاس لگتی ہے تو آپ اپنے اندر کے تقاضے کے لیے اٹھ کے پانی پیتے ہیں۔ اتباع اسے کہتے ہیں۔

۱۴۔ مومن کی پہلی چیز تو یہ ہے کہ وہ اتباع کرتا ہے اقدار خداوندی کا۔ جب کوئی حکم دینے والا نہ بھی ہو تو وہ اپنے دل کے تقاضے سے اتباع کرتا ہے۔

۱۵۔ پانی ندیوں میں رواں اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس پانی کے اندر سڑاند اور بُو پیدا نہ ہو۔ بگاڑ پیدا نہ ہو۔ بند پانی زہر ہو جاتا ہے۔ بہتا چلا جائے تو صاف شفاف رہتا ہے۔

۱۶۔ جو بھی صحیح راستے پر قدم اٹھاتا ہے۔ وہ راستہ اس کے سامنے واضح سے واضح تر ہوتا چلا جاتا ہے مگر قدم اس نے پہلے اٹھانا ہے۔ پہل انسان نے کرنی ہے۔

۱۷۔ دین کی مشکل منزلوں سے پیچھا چھڑانے کا نام 'مذہب' ہے۔

۱۸۔ منافقت میں صرف اور صرف اپنے ہی مفاد کی فکر ہوتی ہے۔

۱۹۔ قرآن محسوس واقعات سامنے لاتا ہے لیکن مقصد اس کا اس کے اندر پنہاں اصول ہوتا ہے یا وہ انسانوں کی نفسیاتی کیفیت کا بیان ہوتا ہے۔ قرآن تاریخی واقعات بیان کرتا ہے تو ان سے نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ قرآن اتنی ہی بات کرتا ہے جتنے سے اس کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ چیزیں ہمیشہ تک رہیں گی۔

۲۰۔ قرآن نہ زبردستی کوئی چیز منواتا ہے نہ جہالت میں رکھنا چاہتا ہے۔

۲۱۔ کسی عضو سے آپ کام لینا چھوڑ دیجئے وہ آپ کے کام آنا چھوڑ دے گا۔

۲۲۔ جب دین مذہب میں بدلتا ہے تو پھر الفاظ تو وہی رہتے ہیں بلکہ رسم بھی وہی رہتی ہے۔ لیکن اس سے آگے کچھ نہیں۔ مسجدوں کا رخ قبلے کی طرف کرنے کے لیے بڑی احتیاط برتی جاتی ہے۔ صرف منہ طرف قبلہ شریف کے زبان سے کہہ دینا یہ سب کے درمیان مشترک رہ گیا ہے۔ مفہوم اس کا بدل دیا گیا۔ مسلمان ممالک میں آپس میں لڑائیاں ہوتی ہیں۔ برسوں جاری رہتی ہیں۔ دونوں کے افراد جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو دونوں کہتے ہیں منہ طرف قبلہ شریف کے

۲۳۔ ایمان محکم اسی طرح سے ہوتا ہے کہ اپنے وعادی کے نتائج سامنے آتے چلے جائیں۔

۲۴۔ فوق الفطرت طریقے سے ہوئی چیز میں حکمت کوئی نہیں ہوتی۔

۲۵۔ مذہب کو اپنی مفاد پرستی کا آلۂ کار بنانا یہ ہے منافقت۔

۲۶۔ اسلامی مملکت کے پاس فی الواقع ایسے ذریعے ہونے چاہئیں جن سے وہ معلوم کر سکے کہ کہنے والا سچ کہہ رہا ہے یا جھوٹ۔

۲۷۔ اس سے بڑا درد انگیز عذاب اور کیا ہے کہ قوم زندہ تو رہے لیکن دوسری قوم کی محکوم و محتاج ہو جائے۔

۲۸۔ تیز عقل والا کم عقل والے کو ہمیشہ جُل دے جاتا ہے اس میں افراد و اقوام دونوں شامل ہیں۔

۲۹۔ دنیا کے کسی مذہب میں حیات و آخرت کا وہ تصور نہیں جو قرآن دیتا ہے۔

۳۰۔ وحی خداوندی آج بھی اپنے ویسے نتائج پیدا کر سکتی ہے جو اس نے کبھی کئے تھے۔ مغرب کے مفکرین اس کی تلاش میں ہیں اور ہم خواب خرگوش میں گم مطمئن بیٹھے ہیں۔ ہمیں کوئی تلاش ہی نہیں۔

۳۱۔ قرآن ایمان والوں سے بھی ایمان کا تقاضا اس لیے کرتا ہے تاکہ ایمان والے کھڑے ہو کر سوچیں کہ ان کا ایمان قرآن کے بتائے ہوئے ایمان کے مطابق ہے یا نہیں۔

۳۲۔ خدا نے خلقِ اول کے بعد خلق جدید کی۔ قرآن نے خلق ثانی نہیں کہا خلق جدید کہا ہے۔ یہ بات بڑی نقطہ آفرین اور غور طلب ہے۔

۳۳۔ ارض کو تمام مخلوق کے لیے پیدا کیا ہے کسی ایک فرد کے لیے پیدا نہیں کیا۔ قرآن ارض پر کسی انسان کی ملکیت قطعی جائز قرار نہیں دیتا۔ زمین کی ملکیت صرف خُدا کی ہے۔ خدا کے ساتھ اور خدا نہ بنا ڈ کہ یہ زمین کی ملکیت انہیں دے دو۔

۳۴۔ جب تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو تو اس وقت کو غنیمت سمجھ کر اسی وقت سے اپنے آپ کو بدلو۔ تم اپنی موت کے وقت کو نہیں جانتے۔

۳۵۔ جس قدر بھی جرائم ہوتے ہیں۔ جس قدر بھی غلط راستے اختیار کیے جاتے ہیں وہ اس باطل بنیاد پر کہ انسان زندگی کو صرف اس دنیا سے وابستہ کیے رکھتا ہے۔ چاہتا اور کرتا یہ ہے کہ یہاں کسی نہ کسی چھل بل سے اس کے جرم کو کوئی دیکھ نہ سکے اور کسی کو پتہ نہ چلنے پائے۔

۳۶۔ مواخذہ کے احساس کے بغیر جرائم کا انسداد نہیں ہو سکتا۔ مواخذہ پر یقین انسان کو جرائم کے ارتکاب سے باز رکھ سکتا ہے۔

۳۷۔ جن کے دلوں میں ایمان گھر نہیں کرتا اس کے مظاہرے ان کے اعمال سے ہوتے ہیں۔

۳۸۔ اسلامی نظام کا تصور کس حسین انداز میں قرآن نے پیش کیا ہے کہ حکومت خدا کی ہوتی ہے۔

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

حقائق و عبر

۱۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا غلامی کے جواز پر اصرار

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب پرویز صاحب کی مخالفت میں اتنے اندھے ہو چکے ہیں کہ ان پر کیچڑ اچھالتے وقت اس امر کی پرواہ بھی نہیں کرتے کہ اس کیچڑ کے چھینٹے صحابہ کرامؓ جیسی پاکیزہ ہستیوں پر بھی جا پڑتے ہیں۔ اس کی تازہ مثال، ان کے ترجمان ماہنامہ "حکمت قرآن" میں شائع شدہ ان کا ایک تازہ مضمون ہے۔ اس میں انہوں نے سورۃ محمدؐ کی آیت ۴ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ساری گفتگو کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ "مَنّ" یعنی احسان کی چار اور فدیہ کی تین شکلیں ہیں۔ اور یہ تمام شکلیں فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً کے الفاظ میں مضمر ہیں۔ اب اگر کوئی شخص محض لغت کی مدد سے ان الفاظ کے معانی سمجھ کر اپنا قول لگاتا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ وہ صریح گمراہی میں ہے۔ قرآن حکیم کے الفاظ کے اصل مفہوم اور ان کے مضمرات و مقدرات کو سمجھتے ہیں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضورؐ سے زیادہ ان کو سمجھنے والا اور کون ہو سکتا ہے..... ایہاں "فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً" کے الفاظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ قرآن میں تو اسیرانِ جنگ کے لیے صرف دو شکلیں بیان ہوئی ہیں۔ اسیر اور غلام بنانے کا پورے قرآن میں سرے سے کوئی حکم موجود نہیں ہے۔ یہ رائے اور یہ نتیجہ سراسر گمراہی ہے۔ یہ رائے سنت رسول، تعامل صحابہ اور اجماع امت پر خط تنسیخ پھیرنے کی جسارت ہے..... میں عرض کر چکا ہوں کہ ہمارے تمام علمائے حق نے اسی آیت سے غلامی کا جواز بھی مستنبط کیا ہے۔ پھر اس کے جواز کے ہمارے پاس سنت رسولؐ، تعامل صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ و تبع تابعین نیز ائمہ مجتہدینؒ کا اجماع ہے۔ اور ان سب کے ہوتے ہوئے کوئی اور رائے رکھنا بہت بڑی جسارت ہے۔ یہاں میں یہ بھی عرض کر دوں کہ اس موضوع پر نہایت مدلل اور جامع

بحث آپ کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم ومغفور کی تفہیم القرآن میں سورۃ محمدؐ کی تفسیر میں ملے گی۔ میں آپ حضرات کو مشورہ دوں گا کہ اس کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔

(ماہنامہ حکمت قرآن بابت اگست ۸۷ء صفحات ۱۳، ۱۴)

مودودی مرحوم نے اس بارے میں جو گل فشانیاں کی ہیں، پرویزؒ صاحب ان کا جائزہ اپنی کتاب غلام اور لونڈیاں میں لے چکے ہیں، جسے حال ہی میں طلوع اسلام ٹرسٹ کی جانب سے بار دگر شائع کیا جا چکا ہے مودودی مرحوم نہ صرف یہ کہ غلامی کو جائز قرار دیتے ہیں بلکہ یہ فتویٰ بھی دیتے ہیں کہ جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو مومن بغیر کسی تعداد کی حد کے اپنے گھروں میں ڈال کر ان سے تمتع کر سکتے ہیں اور جب جی بھر جائے، انہیں فروخت کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو مودودی صاحب کی اور تو کوئی ادا پسند نہ آئی اس لئے وہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہو گئے۔ لیکن غلام اور لونڈیوں کے جواز کے بارے میں انہیں اپنا امام تسلیم کرتے ہوئے لفظ "احسان" کی یہ من مانی تفسیر کرتے ہیں۔

"احسان کی تیسری شکل یہ ہے کہ ان گرفتار شدگان کو غلام کی حیثیت دے کر مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ جان سے مار دینے کے مقابلے میں غلام بنا لینا یقیناً احسان ہی کی ایک صورت ہے۔ پھر یہ کہ اسلام نے غلاموں کو جو حقوق دیئے ہیں اور جو مقام عطا کیا ہے اس کا اس سے قبل کوئی تصور موجود نہ تھا۔ قبل اسلام معاشرے میں غلاموں کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی تھی کہ ان کے آقاؤں کو ان کی جانوں پر اسی طرح اختیار حاصل ہوتا تھا جیسے کسی کو اپنی بھیڑ بکری پر ہوتا ہے کہ جب چاہے اسے ذبح کر دے، کوئی باز پرس نہیں کر سکتا۔"

(ایضاً صـ ۸)

غلامی کو قرآن مجید نے ختم کر دیا تھا صحابہ کرام اور اکثر ائمہ کا یہی مسلک تھا۔ بعض حضرات نے بادشاہوں کی خوشنودی کے لیے اس کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان میں سے کسی مفسر نے 'احسان' کے وہ معنی بیان نہیں کیے جو ڈاکٹر صاحب کے ذہن نے پرویزؒ صاحب پر کیچڑ اچھالنے کے لیے اختراع کیے ہیں۔ سب سے پہلے قرآن مجید کے پہلے مفسر اور مشہور صحابی حضرت ابن عباسؓ کی زبانی اس آیت کی تشریح ملاحظہ ہو:۔

"وقال ابن عباس لما کثر المسلمون واشتد سلطانهم انزل الله عزو جل فی الاساری فامّا مَنًّا بعد واما فداءً وهذا هو اصح والاختیار"

(تفسیر مظہری جلد ۸ صـ ۴۲۲)

ترجمہ حضرت ابن عباس نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ جب مسلمانوں کی تعداد اور طاقت زیادہ ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے جنگی قیدیوں کے بارے میں یہ حکم نازل فرمایا کہ یا تو انہیں احسان کر کے چھوڑ دو یا فدیہ لے کر، علامہ ثنا اللہ پانی پتی، صاحب التفسیر فرماتے ہیں کہ اس آیت کی یہی تفسیر سب سے زیادہ صحیح ہے اور جمہور علماء نے اسے اختیار کیا ہے۔"

اب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب غور فرمائیں کہ جو کیچڑ وہ علامہ پرویزؒ صاحب پر ڈال رہے تھے اس کے چھینٹے حضرت ابن عباسؓ جیسے ممتاز صحابی پر جا پڑے۔

جو علماء غلامی کے جواز کے قائل تھے، انہوں نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی طرح 'احسان' کی کوئی جاہلانہ تاویل نہیں کی۔ کیونکہ اس حکم کی کوئی تاویل ہو ہی نہیں سکتی۔ ہاں انہوں نے اپنے غلط مسلک کو جائز قرار دینے کے لیے اس آیت کو منسوخ قرار دے دیا۔ لیکن جمہور علماء نے ان کے اس استدلال کو تسلیم نہ کیا۔ برصغیر کے ایک مشہور مفسر قرآن علامہ امیر علی اپنی مشہور تفسیر جامع البیان کی چھبیسویں جلد کے صفحہ ۷۶/۸۷۲۰ پر مختلف مفسرین کے اقوال نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"چند علماء کے نزدیک یہ حکم منسوخ ہے اور اکثر علماء نے کہا ہے کہ منسوخ نہیں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کے امام (حکمران) کو اختیار ہے چاہے قیدی کو فدیہ لے کر چھوڑ دے یا مفت چھوڑ دے"

مفسر قرطبی نے یہی مسلک حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت حسن امام عطاؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام ثوریؒ، امام اوزاعیؒ، اور ابو عبیدؒ کا نقل کیا ہے۔

(ملاحظہ تفسیر الجامع لاحکام القرآن جلد ۱۶ صہ ۲۲۸)

علامہ شوکانی اپنی تفسیر فتح القدیر کی پانچویں جلد کے صفحہ ۳۰ پر لکھتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت کے عرب فدیہ کے بغیر قیدیوں کو رہا کرنا، اعلیٰ درجہ کا اخلاق سمجھتے تھے اسلامی اخلاق تو زمانہ جاہلیت کے اخلاق سے بلند ہیں لیکن ڈاکٹر اسرار صاحب اپنی من مانی تاویل سے اسلامی تعلیمات کو زمانہ جاہلیت کے اخلاق سے بھی گھٹیا ثابت کرتے ہیں۔ علامہ آلوسی نے قرآن مجید کی تفسیر روح المعانی حنفی فقہ کی روشنی میں تالیف کی ہے ان کی تحقیق یہ ہے کہ حنفی فقہ کے تمام ائمہ اور دوسرے فقہی مذاہب کے بانیوں کا یہی مسلک تھا کہ اس آیت کے مطابق، قیدیوں کو یا تو احسان کر کے چھوڑ دو یا فدیہ لے کر۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ڈاکٹر اسرار صاحب نے یہ سب کچھ جہالت کی وجہ سے کیا ہے یا پرویز صاحبؒ کی مخالفت میں وہ اتنے اندھے ہو چکے ہیں کہ صحابہ کرام اور ائمہ عظام کی توہین کی بھی پرواہ نہیں کی۔ اگر انہوں نے جہالت کی وجہ سے کیا ہے تو ان کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کیے بغیر اپنے کسی مخالف پر اس طرح کیچڑ نہ اچھالیں کہ جس کی زد صحابہ کرامؓ جیسی پاکیزہ ہستیوں پر جا پڑے۔

۲- قربانی کی کھالوں کا کرشمہ!

قارئین طلوع اسلام جانتے ہیں کہ اہل حدیث اور حنفی مولویوں کے درمیان دو تین مسائل پر سر پھٹول ہوتی رہتی ہے۔ یہ مسائل آمین بالجہر، رفع یدین اور تقلید ہیں۔ ان مسائل کے حوالے سے حنفی فقہہ کی مذمت کی جاتی ہے۔ لیکن جب پیٹ کا مسئلہ آتا ہے تو اہل حدیث حضرات اپنے ائمہ حدیث کو چھوڑ کر حنفی فقہاء کا دامن تھام لیتے ہیں۔ یہ مسئلہ قربانی کی کھالوں کا ہے۔ تمام ائمہ حدیث کے نزدیک قربانی کی بجائے اس کی قیمت خیرات میں دی جا سکتی ہے۔ لیکن حنفی فقہاء کے نزدیک ایسا کرنا جائز نہیں۔ چنانچہ فرقہ اہل حدیث کے ایک بہت بڑے عالم حنفی فقہ کی معتبر کتابوں سے حنفی فقہاء کے فتاویٰ نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"فقہائے کرام کے فتویٰ کو واضح کرنے کے لیے یہ چند عبارات کافی ہیں۔ اس میں یہ حقیقت صاف طور پر سامنے آگئی ہے کہ:۔

قربانی کے ایام میں جانور ذبح کرنے سے ہی قربانی ادا ہو سکتی ہے۔ قیمت تو درکنار خود زندہ جانور کے صدقہ کر دینے سے بھی قربانی کے وجوب سے کوئی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔"

(ہفت روزہ الاعتصام لاہور بابت ۳۱ جولائی ۸۷ء ص ۱۷)

لطف کی بات تو یہ ہے کہ اس مضمون سے پہلے کے صفحہ پر امام ابن حزم کی کتاب المحلی، کے ترجمے کا اشتہار ہے۔ اس کتاب کی جلد ہفتم کے صفحہ ۳۵۸ پر امام صاحب نے واضح کیا ہے کہ صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت اور امت مسلمہ کے تمام ائمہ حدیث کے نزدیک قربانی کی قیمت خیرات میں دینی جائز ہی نہیں بلکہ احسن ہے لیکن اس فتویٰ سے قربانی کی کھالوں سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے اہلحدیث علماء نے حنفی فقہاء کا دامن تھام لیا۔ یہی نہیں بلکہ اس سے اگلے صفحہ پر ان لوگوں پر لعن طعن کی ہے جو قربانی کی بجائے اس کی قیمت خیرات میں دینے کا عقیدہ رکھتے ہیں، ان کے پیٹ کے مفاد نے انہیں

اتنا اندھا کر دیا ہے کہ انہیں یہ احساس بھی نہ ہوا کہ ان کے اس لعن طعن کی زد صحابہ کرامؓ اور تمام ائمہ حدیث پر پڑ رہی ہے۔

علامہ پرویز صاحب مرحوم بالکل صحیح فرماتے تھے۔ کہ مولوی کا اصل مسئلہ اس کا پیٹ ہے۔ یہ مسئلہ حل کر دیا جائے تو مسلمانوں میں فرقہ بازی ختم ہو جائے۔

۳۔ شریعت بل اور وفاقی شرعی عدالت

مجوزہ شریعت بل کی سب سے اہم دفعہ یہ ہے کہ وفاقی شرعی عدالت کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ ہر معاملے کے اسلامی، یا غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ دے سکے۔ اول تو شریعت بل کا پاس ہونا ہی محل نظر ہے، لیکن اگر یہ بالفرض پاس بھی ہو گیا تو یہ عوام کو دھوکہ دینے کے مترادف ہوگا۔ اس کی وضاحت کے لیے ہفت روزہ تنظیم اہلحدیث نے وفاقی شرعی عدالت کے ایک اہم فیصلے کا ذکر کیا ہے۔ یہ فیصلہ گھوڑ دوڑ کے نام پر قمار بازی کے حرام ہونے کے بارے میں ہے۔ لیکن عدالت کے فیصلے کے باوجود یہ حرام کاروبار جاری ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

"واقعہ یہ ہے کہ ریس کلب میں گھوڑ دوڑ کے نام پر قمار بازی کا سلسلہ پورے زور شور سے جاری ہے جس کے ثبوت میں متعدد اخباری بیانات موجود ہیں، جن میں لوگوں نے اپنے مشاہدات اور جوئے کی تمام تفصیلات اور دیگر ضروری کوائف بیان کیے ہیں۔

انہی حقائق و کوائف کے پیش نظر جب وفاقی شرعی عدالت میں یہ مسئلہ پیش ہوا تو شرعی عدالت نے بھی ریس کلب والوں کے موقف سے اتفاق نہیں کیا اور ریس کلب میں گھوڑ دوڑ کی موجودہ شرطوں کو قمار بازی ہی قرار دیا۔ شرعی عدالت میں اس کیس کی سماعت مارچ ۸۴ء میں ہوئی ریس کلب والوں نے جناب اے کے بروہی ایڈووکیٹ کی خدمات حاصل کی تھیں۔ جن کے اصل پشت پناہ بدقسمتی سے بعض علما ہی تھے _____ اے کے۔ بروہی صاحب نے اُن علماء کی معاونت سے یہی کچھ باور کرانے کی مذموم سعی کی تھی جو خط کے مذکورہ بالا مندرجات میں کی گئی ہے۔

فاضل عدالت نے اس سلسلے میں ہر مکتب فکر کے جید علماء سے رائے طلب کی تھی، جن میں رفیع اللہ شہاب، مفتی سیاح الدین کاکاخیل، مفتی محمد حسین نعیمی، مولانا تاج الدین حیدری اور

صدرالدین رفاعی شامل تھے۔ حکومت کی طرف سے ڈپٹی اٹارنی جنرل جناب ریاض الحسن گیلانی نے نمائندگی کی۔ کیس کی سماعت فل کورٹ نے کی تھی، جن میں سردار فخر عالم جسٹس چوہدری محمد صدیق صاحب جسٹس مولانا غلام علی (اب ریٹائر ہو گئے) جسٹس مولانا عبدالقدوس قاسمی، جسٹس فخرالدین اور چیف جسٹس جناب گل محمد خاں شامل تھے۔

فاضل عدالت کے فل بنچ نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ دیا کہ پیغمبر اسلام ؐ نے جن حالات میں شرط لگانے کی اجازت دی تھی، ان میں سے اب کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ عدالت نے اس بات سے اتفاق نہیں کیا کہ انسانوں کی روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے گھوڑوں کی تربیت ریس کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ گھڑ سواری میں شرطیں لگانے کے بارے میں عدالت نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف گھڑ سواروں کو اپنے گھوڑے دوڑانے پر انعامات دیے۔ شائقین گھڑ دوڑ کے بارے میں عدالت نے صاف الفاظ میں واضح کیا کہ علماء نے کسی بھی صورت میں تماشائیوں کو شرطیں لگانے کی اجازت نہیں دی۔

فاضل عدالت کے اس فیصلے کا ضروری خلاصہ ۱۳ جنوری ۱۹۸۶ء کے اخبارات میں شائع شدہ موجود ہے، اسے ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔"

(ہفت روزہ تنظیم اہلحدیث جلد ۳۱ شمارہ ۵ صـ اول)

۴۔ کہیں تم مسلمان تو نہیں ہو گئے؟

اس سلسلے میں ماہنامہ محدث مسلمانوں پر ایک عیسائی پادری کے طنز کا یہ واقعہ نقل کرتا ہے۔

"چند دن قبل ملتان سے چھپنے والے ایک رسالہ میں ایک عیسائی ملک کے، عیسائی باشندے کا واقعہ پڑھا تھا کہ اس نے اپنے ایک ہم مذہب کو کچھ رقم قرض دی، جب قرض کی وصولی کا وقت آیا تو مقروض نے ٹال مٹول شروع کر دی ـــــ بار بار کے مطالبوں کے باوجود جب وہ قرض وصول کرنے میں ناکام رہا تو کچھ دوستوں کو اس نے اپنی بپتا سنائی۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ پادری سے ملو۔ یہ شخص پادری کے پاس گیا اور صورت حال اس کو بتلائی۔ پادری نے کاغذ قلم منگوا کر ایک دوسطری رقعہ لکھا۔ اور اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ یہ رقعہ مقروض کو جا کر دے دو۔ مقروض نے رقعہ وصول کر کے اسے پڑھا اور جھٹ سے پوری رقم گن کر اس کے

حوالے کر دی ـــــ دیکھنے سننے والوں نے تعجب کا اظہار کیا اور پوچھا کہ اس رقعہ میں ایسی کون سی کرامت تھی کہ یوں فی الفور اس نے رقم ادا کر دی؟ اس شخص نے جواب دیا، پادری نے مکتوب الیہ کو لکھا تھا۔

"تم اس شخص کی رقم دبائے بیٹھے ہو، کہیں تم مسلمان تو نہیں ہو گئے"

اس پر اسے غیرت آئی تو اس نے رقم ادا کر دی (فاعتبروا یا اولی الابصار!)

(ماہنامہ محدث بابت جولائی ۱۹۸۷ء ص ۴۵)

اس سے ظاہر ہے کہ اس وقت دنیا میں مسلمان بد دیانتی کے لیے ضرب المثل بن چکے ہیں۔ مسلمانوں کو بد دیانت اور بد کردار بنانے کے ذمہ دار کون لوگ ہیں اس بارے میں محدث کے مدیر اپنا فیصلہ ان لفظوں میں دیتے ہیں۔

"چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ عوام الناس کے اعمال و اخلاق اور کردار میں خرابی، علماء کی خرابی و فساد کی وجہ سے ظہور میں آتی ہے ـــــ ایک تو اس لیے کہ جب علمائے امت اپنا فرض منصبی ادا کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو عوام الناس کو روکنے والا کوئی نہیں ہوتا، لہٰذا وہ من مانی کرنے لگتے ہیں اور دوسرے اس لیے کہ جب خود علماء ہی میں نقص آجائے تو خود ان کا وجود اور ان کا طرزِ عمل عوام الناس کی آوارگیوں کے لیے سندِ جواز مہیا کر دیتا ہے، جس کے نتیجہ میں پوری امت فساد اور بد عملی کی لپیٹ میں آجاتی ہے۔ (ایضاً ص ۴۵)

۵۔ شریعتِ اسلامیہ کی جامعیت و ابدیت

ہفت روزہ تنظیم اہلحدیث اس عنوان کے تحت اپنی ۳ جولائی ۸۷ء کی اشاعت کے ٹائیٹل کے صفحہ پر مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کا یہ اعلان نقل کرتا ہے۔

"ایک طرف مسلمانوں کی معاشرتی و اجتماعی زندگی مختل ہو رہی ہے۔ کیونکہ اس کی تمام ضرورتوں کے مطابق احکام فقہ نہیں ملتے۔ اور شریعت کو فقہ کے مذاہبِ مدوّنہ (فقہ اربعہ) میں منحصر سمجھ لیا گیا ہے۔ دوسری طرف اسلامی حکومتوں نے قوانین شرع پر عمل درآمد ترک کر دیا ہے اور اس کی جگہ یورپ کے دیوانی اور فوجداری قوانین اختیار کرنے لگے ہیں کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ وفاتر فقہ وقت کے انتظامی و معاشرتی مقتضیات کا ساتھ نہیں دے سکتے اور کوئی

(باقی ص ۱۱ پر)

احمد شہباز، متعلم ایم۔ بی۔ بی۔ ایس سال اوّل۔

بزمِ مذاکرہ طلوع اسلام کنونشن ۸۷ء

مذاکرہ

(۳)

کہا جاتا ہے ہماری تعلیم بے سمت ہے، معیارِ تعلیم سے ہر کوئی نالاں ہے۔ اُستاد بھی، شاگرد بھی۔ اس انحطاط کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں، لیکن اس وقت یہ دیکھنا ہے کہ کیا اس کی ذمہ دار سوسائٹی یعنی معاشرہ تو نہیں؟ پیشتر اس کے کہ اپنی طرف سے کچھ کہا جائے "انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز اسلام آباد" کے ورکنگ گروپ نے تعلیم پر اپنی رپورٹ میں جو کچھ کہا ہے، اُسے آپکی خدمت میں پیش کیا جائے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ

"ملک میں حقیقی ترقی ایک اچھے نظامِ تعلیم کے بغیر ناممکن ہے۔ لیکن یہ امر افسوسناک ہے کہ ہماری اب تک کی معاشی منصوبہ بندی میں تعلیم کے شعبہ کو بہت کم ترجیح دی گئی ہے، معیارِ تعلیم مسلسل گرتا چلا جا رہا ہے، اور ہماری خواندگی کی شرح دنیا بھر میں سب سے کم ہے۔ مزید یہ کہ تعلیمی سہولتیں مضامین کے لحاظ سے یوں منظم نہیں ہیں کہ وہ ویسے ہی لوگ تیار کریں۔ جیسے روزگار کے مواقع میسر ہوں نتیجتاً تعلیمی اداروں سے فارغ ہونے والے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد بے روزگار یا بیکار رہ جاتی ہے۔ نظامِ تعلیم میں یہ خامی ہے کہ یہ نہ صرف نوجوانوں کی اخلاقی نشوونما نہیں کر سکا بلکہ ان میں یہ ہمت بھی پیدا نہیں کر سکا کہ وہ زندگی کو اُس کے حقیقی تناظر میں دیکھیں۔ مزید برآں اُمرا اور عوام کے لیے الگ الگ تعلیمی ادارے ہیں۔ جس سے دونوں طبقوں کے نوجوانوں کے علم کی سطح اور معیار میں بڑا فرق رہ جاتا ہے۔ چنانچہ تعلیم، سماجی و اقتصادی تفرقات کو مٹانے کی بجائے اس کے برعکس اثر کر رہی ہے ملک میں شرحِ خواندگی بڑھانے کے لیے حکومت کی موجودہ مہم اچھا اقدام ہونے کے باوجود بے اثر ہو گی۔ جب تک تعلیمی میدان کے دیگر مسائل کی اصلاح نہیں کی جاتی، اِن مسائل کی اصلاح کیے بغیر شرحِ خواندگی بڑھانے کی یہ مہم افرادی اور مالی وسائل کا ضیاع اور مذکورہ مسائل کو بڑھانے کا باعث بنے گی"

(روزنامہ جنگ، مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۸۷ء)

اس رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ

۱۔ تعلیم کے فروغ کیلئے ملک میں کوئی مؤثر منصوبہ بندی نہیں۔

۲۔ مروجہ تعلیمی نظام میں درس گاہوں کی اسطرح درجہ بندی کی گئی ہے کہ اُمرأ اور عوام کے لیے الگ الگ تعلیمی ادارے ہیں، جس سے دونوں طبقوں کے نوجوانوں کے علم کی سطح اور معیار میں بڑا فرق رہ جاتا ہے۔

۳۔ صحیح تعلیم کا بندوبست اور منصوبہ بندی کرنا معاشرہ کی ذمہ داری ہے، طلبہ خود بخود اپنے تئیں ایسا نہیں کر سکتے۔

۴۔ لہٰذا مروجہ تعلیم بے سمت ہے۔

گرامی قدر! قائداعظمؒ نے پاکستان بننے کے ساتھ ہی ۲۷ نومبر ۱۹۴۷ء کو کراچی میں منعقدہ "آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس" کو تعلیم کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے فرمایا تھا۔

"اگرچہ ہم ایک صدی سے زائد عرصہ تک بیرونی حکومت (انگریزی راج) کے ماتحت رہے ہیں لیکن پھر بھی ہم ان کے رائج کردہ تعلیمی نظام کو نفی کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے اور اُن کے نظریات میں کافی فرق ہے۔ لہٰذا پاکستانی عوام کو ایسا نظامِ تعلیم دیں گے کہ جس میں جدید تقاضوں کو قدر و منزلت ملے گی اور ہماری ترقی کی راہیں ہموار ہوں گی"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ملک کے مستقبل کا دارومدار طرزِ تعلیم پر ہے اس لیے ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنے بچوں اور نوجوان نسل کو ایسا نظامِ تعلیم دیں کہ جس میں فنی، علمِ معاشیات اور دیگر بہترین انڈسٹریل منصوبہ بندی ہو جس سے وہ استفادہ کر کے ملک و ملت کی خدمت کر سکیں"

"ہمیں نئی نسل کی جسمانی و ذہنی نشوونما کرنی ہے اس لیے انہیں تعلیم سے آراستہ کیا جائے تاکہ معاشی زندگی کے ہر شعبہ میں شعور اور خود اعتمادی پیدا ہو۔ اور وہ اعلےٰ اخلاق و اقدار کے مالک ہوں"

حاضرینِ مکرم! قائداعظمؒ کے محولہ بالا بیان سے بھی صاف ظاہر ہے کہ معیاری تعلیم کا بندوبست کرنا معاشرہ کی ذمہ داری ہے۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ معاشرہ تو اس ذمہ داری سے لاتعلق نظر آتا ہے۔ جیسے اس فریضہ کا تعلق زمین سے نہیں عالم آفاق سے ہے۔ اس پر علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں یہی کہنا پڑتا ہے کہ

نہ دیا نشانِ منزل مجھے اے حکیم تو نے — مجھے کیا گلہ ہو تجھ سے تو نہ رہ نشیں نہ راہی

جدید معاشرہ کا واسطہ اُن گزرگاہوں سے نہ پڑا ہو جس پر انسان چل کر کندن بن جاتا ہے۔ لیکن یہ مسئلہ تو

اُن لوگوں کے لیے مُشکل ہوتا ہے جن کے سامنے خدا کی عطا کردہ اقدار نہ ہوں۔ لیکن جہاں اقدار بھی ہوں۔ اور اُن اقدار سے مربوط نظائر بھی ہوں۔ وہاں تو کوئی دِقّت یا دشواری نہیں ہونی چاہیئے۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم کے اُس مقام کو سامنے لائیے جہاں آدمؑ حقیقی علم کی بدولت مسجودِ ملائک ٹھہرا۔ اسی تعلیم کی ترویج کے لیے امام الناس حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ وسلام اور اُن کے فرزند اکبر حضرت اسمٰعیلؑ نے تعمیر خانہ کعبہ کے وقت اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگی تھی۔

اے ہمارے پروردگار ہماری ذرّیت سے ایک امت مسلمہ پیدا کرنا جو خالصتاً تیری فرمانبردار ہو ..... پھر انہی میں سے ایک رسول پیدا کرنا جو انہی میں سے ہو۔ اور جو اُنہیں تیرے عطا کردہ قانون یعنی کتاب کی تعلیم دے اور اُنہیں یہ بتائے کہ اس قانون کے اتباع سے کس طرح اُن کی ذات کی تکمیل ہوگی اور خوشگوار زندگی حاصل ہوگی (۲/۱۲۸-۲۹)

حضرت ابراہیمؑ کی دعا کو شرفِ قبولیت حاصل ہُوا۔ اور نبی اکرمؐ نے قرآنِ حکیم کے عطا ہونے پر قرآنِ حکیم کا تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ مدینہ منورہ میں وسعت پذیر ہوا۔ اور درس وتدریس کا باقاعدہ اہتمام کیا گیا۔ جیسا کہ سورۃ الفرقان میں مذکور ہے کہ

قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۲۵/۵

کفار کا کہنا ہے کہ قرآن پہلے لوگوں کے قصہ کہانیاں ہیں جو محمدؐ نے اپنے پاس سے لکھ لی ہیں پھر اس قرآن کی املا یعنی اس نسخہ صدر سے متعدد نسخے لکھائے جاتے اور اُنکی تعلیم دی جاتی۔

گویا اسلام کی سب سے پہلی جامعہ حضورؐ کی نگرانی میں مدینہ منورہ میں قائم ہوئی اور اس تعلیم ہی کا اثر تھا کہ جذبہ ایمانی سے سرشار ۳۱۳ مجاہدین پر مشتمل جماعت نے کفار کے دو ہزار سپاہیوں کو، جو ساز و یراقِ مبارزت سے پوری طرح لیس تھے، شکست فاش دی۔ یہ اُس نظامِ تعلیم کا صدقہ تھا جو قرآنی اقدار سے مرصّع تھی۔ وہ اقدار آج بھی موجود ہیں اور اُن کے اتباع سے آج بھی وہی نتائج پیدا ہو سکتے ہیں جو اُس وقت ہوئے تھے۔ کیونکہ یہ اقدار زمینی مخلوق کیلئے ہیں آفاقی مخلوق کے لیے نہیں۔

پھر ایک ایسی درسگاہ کی مثال آپکے سامنے ہے جسے ملتِ اسلامیہ کے مردِ مجاہد محترم سرسید احمدؒ خاں نے بے سروسامانی کے عالم میں علی گڑھ میں قائم کیا۔ لیکن اِن نظائر کو سامنے رکھنا معاشرہ کا فرض ہے۔ تاکہ تعلیم کا صحیح خطوط پر بندوبست ہو سکے۔

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے۔ کہ توڑ پھوڑ، آتش زنی، پتھراؤ، خون خرابہ، ہڑتال وغیرہ کا صرف طالبعلموں اور نوجوانوں کو موردِ الزام ٹھہرانا غلط نگہی ہے۔ عصر حاضر میں اس کی بیشتر ذمہ داری ان سیاسی اور مذہبی جماعتوں

پر بھی عائد ہوتی ہے۔ جو اپنے حصول مقصد کے لیے طالب علموں کو آلہ کار بنائے ہوئے ہیں۔ یہ اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھے ہیں کہ قوموں کی کامیابی اور کامرانی کا انحصار نوجوانانِ ملت کی سیرت پر ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ اگر ملک وملّت کی یہ متاع اس طرح لٹتی رہی، تو کل کو ملک کی بھاگ ڈور کون سنبھالے گا۔ لیکن مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ اقبال کے الفاظ ہیں۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے　　ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

گویا ملت کی کشتِ ویراں کا نم اُس آبِ نشاط انگیز سے حاصل ہوتا ہے جسے قرآن کہتے ہیں۔ قرآن کے مقرر کردہ حدود وقیود ہی وہ پختہ ساحل ہیں، جو حیاتِ انسانی کی جوئے رواں کا رُخ متعین کرتے ہیں۔ لیکن انسانی دنیا کے اندر یہ انقلاب صحیح تعلیم کی رو سے لایا جاسکتا ہے۔ اس لیے معاشرہ کے لیے کرنے کا کام یہ ہے۔ کہ ان بچوں کی صحیح تعلیم کا بندوبست کر دیا جائے۔ ان کی گزرگاہوں کو وہ ساحل مہیا کر دیئے جائیں جن کی بنیاد اُن قوانین اور اصولوں GUIDELINES پر ہو جو قرآنِ حکیم کی دفتین میں موجود ہیں۔ جنہیں کہیں باہر سے درآمد یعنی "IMPORT" کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہی وہ واحد طریقہ ہے۔ جس سے ملک وقوم کی یہ عظیم متاع محفوظ ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو مجوزہ درس گاہیں ایسی درس گاہیں بن جائیں گی جو ان درس گاہوں سے مختلف ہوں گی جن کے متعلق یہ کہا جاتا ہے۔

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

والسلام

خریدار صاحبان متوجّہ ہوں

خط وکتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

۱۔ بسا اوقات ادارہ ہذا کے نام جو منی آرڈر موصول ہوتے ہیں ان کے کوپنز (COUPONS) پر خریدار کا مکمل پتہ نہیں لکھا ہوا ہوتا۔ اس کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ تعمیل میں بلاوجہ تاخیر نہ ہو۔

۲۔ پرچہ نہ ملنے کی اطلاع خریدار ماہ رواں کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں۔ اس صورت میں ہی پرچہ دوبارہ ارسال کیا جائے گا۔

۳۔ جواب طلب امور کے لیے جوابی لفافہ ارسال کریں۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

سلیم عبد القیوم

مذاکرہ

(۴)

والدین کی ذمہ داری حاضرین کرام! نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق، بہترین عطیہ جو والدین اپنی اولاد کو دیتے ہیں، وہ اعلیٰ تعلیم ہے۔ اس لئے والدین کا یہ مقدس فریضہ ہے کہ وہ پرورش کے علاوہ بچے کی تعلیم و تربیت کے لئے ہر امکانی کوشش کریں تاکہ وہ اس دولت سے تہی دامن نہ رہ جائے۔ اس لئے بچے کے ماں باپ کی یہ دوہری ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ ایسے اقدام کریں جس سے بچہ قابلِ رشک تعلیم حاصل کر کے معاشرہ میں ایک بے مثال مقام حاصل کر سکے۔ اس سلسلہ میں والدین ابتدائی تعلیم کے دوران بچوں کو گھر کی چار دیواری کے اندر رہنمائی یعنی "GUIDENCE" تو دے سکتے ہیں، لیکن باقاعدہ تعلیم متعلقہ درس گاہوں ہی میں ممکن ہے۔ اگر محض گھر کے اندر ہی صحیح تعلیم ممکن ہوتی تو پھر درسگاہوں کی کیا ضرورت تھی؟ تاہم بچوں کی تعلیم و تربیت کا سارے کا سارا بوجھ والدین پر نہیں ہونا چاہیئے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ تعلیم یافتہ اور اونچے گھرانے کی اولاد بھی تعلیم یافتہ ہو، کیونکہ بچے والدین سے تعلیم ورثہ میں نہیں لیتے۔ ورثہ میں صرف انسانی کیفیت اور ماہیت اور نشوونما کے میلانات لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ جسے "HEREDITY" کہتے ہیں۔ اس طرح انسانی بچہ ورثہ کی وجہ سے انسان کہلاتا ہے۔ اگر صحیح تعلیم والدین سے ورثہ میں مل سکتی، تو نیک اور پارسا آدمیوں کی اولاد بالکل ان کے نقشِ قدم پر چلتی اور ان کے مسلک سے ہم آہنگ ہوتی۔ لیکن اس سلسلہ میں کچھ ایسی مثالیں ملتی ہیں، جہاں کچھ اولاد باپ یا ماں یا دونوں کے نظریات تصورات، خیالات اور مسلکِ دین سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اس میں انسانی ورثہ کا نقص نہیں، بلکہ بیرونِ خانہ ماحول کا اثر ہوتا ہے۔

گرامی قدر! سب سے ارفع اور اعلیٰ زندگی ایک نبی کی زندگی ہوتی ہے۔ چاہیئے تو یہ کہ ان کی تمام تر اولاد پر ان کی تعلیمات کا اثر ہوتا، لیکن یہاں بھی ماحول کا غلبہ رہا۔ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام ایک جلیل القدر نبی تھے۔ لیکن ان کے بیٹے پر اُن کی تعلیم کا کوئی اثر نہ ہوا۔ غلط بیرونی ماحول کی وجہ سے انتہائی نافرمان اور

سرکش نکلا۔ اُس کے اس رویہ پر اللہ تعالےٰ کو حضرت نوحؑ سے یہ کہنا پڑا کہ "یہ تیرے اہل میں سے نہیں۔ (اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِکَ ۱۱/۴۶) اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حضرت نوحؑ کی تعلیم میں کوئی کمی تھی۔ دین میں کوئی اکراہ یعنی "COMPULSION" نہیں۔ ہدایت وہی حاصل کر سکتے ہیں، جو ہدایت حاصل کرنا چاہیں۔ اس لیے حضرت نوحؑ نے اپنے بیٹے پر کوئی جبر نہیں کیا

اولاد کا کردار اب آیئے اولاد کے کردار کی طرف۔ جب تک اولاد ماں باپ کی پرورش، تربیت اور حفاظت میں ہے، اُس وقت تک اسے والدین کی ہدایات اور نصائح کے مطابق عمل کرنا چاہیئے۔ لیکن جب وہ اپنے معاملات کے فیصلے آپ کرنے کے قابل ہو جائے۔ اس وقت اسے فیصلے خود کرنے چاہییں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنے ماں باپ کو کنارے پر بٹھا دے کہ اب اسے اُن کے مشورہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ مشورہ تو انسان غیروں سے بھی کر لیتا ہے۔ رہی بات ماں باپ کی عزت اور احترام کی تو قرآنِ حکیم اولاد کو ماں باپ سے حسنِ سلوک سے پیش آنے کی ہدایت کرتا ہے۔ (۱۷/۲۳)

معاشرہ کی ذمہ داری اگرچہ ابتدائی تعلیم کا مرکز گھر ہوتا ہے، لیکن اسلام کے اندر حکومت کا تصور ہی یہ ہے کہ وہ مملکت کے اندر لوگوں کی ہر قسم کی معاشرتی اور معاشی زندگی کی فلاح و بہبود کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس میں سب سے اہم شعبہ تعلیم کا ہے، جس کے ذریعہ ایک انسانی بچہ حقیقی معنوں میں انسان بن سکتا ہے اور اس معیار پر پورا اتر سکتا ہے جس کا اس سے تقاضا کیا جائے۔ اس لیے یہ اسلامی حکومت کا اولین فریضہ ہے کہ وہ اس کے متعلق قواعد و ضوابط نافذ کرے اور اس قسم کے انتظامات کرے کہ کوئی بچہ سامانِ پرورش اور اسبابِ تعلیم و تربیت سے محروم نہ رہنے پائے۔ اس سلسلہ میں جس ممکن حد تک بچے کے ماں باپ کے تعاون کی ضرورت ہو، اس کے لیے حکومت ضروری ہدایات نافذ کرے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ بچہ ماں باپ کی عدم توجہی، جہالت، معاشی مشکلات کی وجہ سے ایسا نہ رہ جائے کہ اس کی انسانی صلاحیتیں نشوونما نہ پا سکیں۔ اس کے مواقع ہر انسانی بچہ کے لیے یکساں ہونے چاہییں۔ ہر فرزندِ آدم، انسان ہونے کی جہت سے قابلِ تکریم ہے (۱۷/۷۰) اس لیے اسلامی حکومت کو ایسے نظام کی ضمانت دینا ہوگی جس کا محور قرآنی اقدار ہوں، جس سے تمام لوگوں کی ضروریاتِ زندگی، اُنہیں بلا مزد و معاوضہ مہیا ہوتی رہیں، تاکہ مفلسی اور سفید پوشی کے اثر سے بچے تعلیم و تربیت سے محروم نہ رہنے پائیں۔ کیونکہ مروجہ نظام میں اکثر والدین ایسے ہیں جو تعلیم کے اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے لہٰذا موجودہ حالات اس کے متقاضی ہیں کہ معیاری درس گاہیں قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ حکومت اُن موانعات کے دُور کرنے کا بھی بندوبست کرے جو والدین کے لیے سوہانِ روح بنے ہوئے ہیں۔ والدین ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ اُن کی اولاد جاہل

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

خالد عمر

مذاکرہ

(۵)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانی راہنمائی بذریعہ وحی انبیاء کرامؑ کی وساطت سے آتی رہی۔ اس ضمن میں سلسلۂ نبوت کا یہ اسلوب رہا ہے کہ کوئی نبی جس قوم کی طرف مبعوث ہوتا، وہ اسی قوم کا فرد ہوتا تھا اور اس پر خدا کی طرف سے وحی اُسی قوم کی زبان میں آتی جس کی طرف وہ مبعوث ہوتا۔ چنانچہ نبی اکرمؐ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "ہم نے یہ قرآن تمہاری زبان میں آسان نازل کیا" (۱۹/۴۴) اور دوسری جگہ ارشاد ہوا کہ "ہم نے قرآن کو عربی میں نازل کیا تاکہ تم آسانی سے سمجھ سکو" (۱۲/۲۱) اس کی وجہ ظاہر ہے کہ قومِ مخاطب کی زبان عربی تھی۔ اور وہ پیغامِ خداوندی کو صحیح طور پر اُسی زبان میں سمجھ سکتے تھے کہ اُن کے اعمال کا رُخ صحیح سمت کی طرف ہوتا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ انسان اپنے خیالات اور تصورات کا اظہار، اور ذہن کی عکاسی اپنی ہی زبان میں کر سکتا ہے۔ اظہار کے علاوہ، جہاں تک عمل کا تعلق ہے، اس کا بھی زبان سے گہرا رابطہ ہے۔ کوئی انسان اس وقت تک صحیح عمل نہیں کر سکتا جب تک وہ یہ نہیں سمجھتا کہ پیغامِ عمل کا مدعا کیا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب ہمارے سامنے وہ ذریعہ تعلیم (Media) آتا ہے جو مروجہ درس گاہوں اور تعلیمی اداروں میں رائج ہے۔ اگرچہ ہم نے انگریز سے آزادی حاصل کر لی لیکن ذہنی طور پر ابھی تک ان کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ ہماری تعلیم کے ہبوط کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہماری تعلیم کا (Media) اکثر انگریزی ہے۔ کافی عرصہ کی بات ہے کہ جہاں کسی امتحانی پرچہ کا جواب اُردو میں دینا ہوتا وہاں سوال انگریزی میں ہوتا اور اکثر طلبا اس پرچہ میں اس لئے فیل ہو جاتے کہ وہ سوال کو جو کہ انگریزی میں ہوتا، سمجھ نہیں سکتے تھے۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے جو جواب لکھا ہوتا وہ بالکل صحیح ہوتا، لیکن وہ کسی اور سوال کا جواب ہوتا جو امتحانی پرچہ میں نہیں پوچھا گیا تھا۔ اس طرح طالب علم بیچارے صحیح جواب لکھنے کے باوصف فیل ہو جاتے۔

اگرچہ گفتگو کا موضوع مروجہ درسگاہوں میں ذریعہ تعلیم (Media) ہے۔ تاہم یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں قومی زبان کے مسئلہ پر بھی تھوڑی سی گفتگو کر لی جائے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ تحریکِ پاکستان

کے وقت بانیٔ پاکستان حضرت قائدِ اعظمؒ نے بصراحت فرمایا تھا کہ پاکستان کے اندر قومی زبان اُردو ہوگی اور ۱۹۴۸ء کے آغاز میں اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا تو آپ نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ جو شخص اُردو کے خلاف بات کرتا ہے وہ پاکستان کا غدار ہے۔ اس پر سب نے صاد کیا۔ اور کوئی ایک آواز بھی اس کے خلاف نہ اٹھی۔ وہ اس لیے کہ پاکستان ایک تحریک کا نتیجہ ہے۔ اور اس تحریک کا ایک مطالبہ اُردو کا تھا۔ یہاں یہ وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ اُردو پاکستان کے کسی خاص خطہ کی زبان نہیں بلکہ سارے پاکستان کی ایک مشترکہ زبان Lingua Franca ہے۔

محترم سامعین! زبان کے نفاذ کو تو چھوڑیئے، ستم بالائے ستم یہ کہ چالیس سال ہونے کو آئے ہیں، پاکستان کے اندر وہ نظام قائم نہ ہو سکا جس کے لیے یہ خطۂ ارض حاصل کیا گیا تھا۔

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

صاحبِ صدر! جو ممالک تعلیم یافتہ ہیں، ان کی ترقی کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اپنی زبان کو دوسری زبانوں پر فوقیت دی ہے۔ کیونکہ، ان کے خیال کے مطابق قومی زبان کے استعمال سے ملکی اور شخصی آزادی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں، میں سامعین کرام کی خدمت میں ایک مضمون کا اقتباس پیش کرتا ہوں جو روزنامہ جنگ مورخہ ۱۳ اپریل ۱۹۸۷ء میں "قومی زبان کے استعمال سے ملکی اور شخصی آزادی کا اظہار ہوتا ہے" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ راقم لکھتا ہے۔

ایک انگریز خاتون سے ہماری ایک محفل میں بات چیت ہوئی تو ان کی باتیں سُن کر ہمیں سخت شرمندگی ہوئی۔ کہنے لگیں کہ اس محفل میں تقریباً تمام لڑکیاں اور عورتیں انگریزی بول کر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ابھی تک آپ کے ذہنوں پر حکومت کر رہے ہیں۔ اس خاتون کی اس طنزیہ گفتگو نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا۔ اس دن تو ہمیں اپنے آپ سے بہت شرمندگی محسوس ہوئی کیونکہ سکول اور کالج کی زندگی میں ایسے مضامین سے واسطہ پڑا تھا جس کی وجہ سے ہم اپنی زبان سے تقریباً 'نابلد' تھے۔

ضمناً عرض ہے کہ انگریزوں کے دورِ تسلط میں ہندوستان میں فوجی امور کے سلسلہ میں اُردو (LINGUA FRANCA) تھی۔ اور عام یہ تھا کہ زیرِ تربیت فوجی افسر (cadet) خواہ انگلستان سے آئے ہوں یا ہندوستان کے ہوں، ان کی ٹریننگ کی تکمیل کے بعد کمیشن کا امتحان ہوتا تھا۔ اس میں ان کے لیے اردو میں پاس ہونا لازمی تھا اور اگر کوئی (cadet) اردو کے علاوہ کسی اور مضمون میں فیل ہو جاتا تو اُسے Provisionally

کمیشن دے دی جاتی، لیکن اگر وہ اُردو میں فیل ہو جاتا تو اس کی کمیشن روک لی جاتی۔ اور اس وقت واگذار ہوتی جب وہ اردو کا امتحان پاس کر لیتا۔ صد حیف! انگریزوں کی یہ اچھی بات تو ہم نہ اپنا سکے لیکن ہم نے ان کی وہ چیزیں اپنا رکھی ہیں جن سے ہماری ذہنی ارتقا کی صلاحیتیں منجمد ہو کر رہ گئی ہیں۔ ہمارے ذہن کے زاویوں کا رُخ اگرچہ صحیح ہوتا ہے لیکن اظہار کے زاویوں کا رُخ غلط سمت کی طرف ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سوچتے اپنی زبان میں ہیں۔ اور اظہار اُس پرائی زبان میں کرتے ہیں جس کے سلسلہ میں ہماری Vocabulary تنگ دامن ہوتی ہے۔

اگر پاکستان میں اُردو کو قومی زبان بنایا ہوتا، اور درسگاہوں میں ذریعۂ تعلیم اردو ہوتا تو ان درسگاہوں سے فارغ ہونیوالے نوجوان علم کی دولت سے بدرجہ اتم مالا مال ہوتے۔

صاحبِ صدر! ہم درسگاہوں کو تو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں، لیکن اگر غور کیا جائے تو مروجہ درسگاہوں کا اس میں کیا قصور ہے۔ اصل قصور تو ان Authorities کا ہے جو ان کے متولی ہیں۔ یہ حکومت کا کام ہے کہ وہ اس قسم کا ذریعۂ تعلیم اور نصاب رائج کریں جو اُردو میں ہوں اور اقوامِ غیر کی بجائے اپنے مشاہیر اور قرآنی اقدار کے آئینہ دار ہوں تاکہ طالب علموں کے ذاتی جوہروں کی نمود ہو سکے۔ اور وہ درسگاہوں سے انسان بن کر نکلیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے، کہ ہم دوسری زبانوں کے مخالف ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں! ان زبانوں کو بھی ملکی درسگاہوں میں ضرور پڑھایا جانا چاہیئے کیونکہ اس سے علمی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن ان کی حیثیت ثانوی ہونی چاہیئے۔ اور اپنی زبان کو دوسرے ممالک کی طرح ان پر فوقیت ہونی چاہیئے۔

بقیہ: مذاکرہ (۴)

اور ناخواندہ ... اور رموزِ حیات سے بے بہرہ رہے، کیونکہ یہ شرفِ انسانیت کے منافی ہے۔ والدین تو ہر لمحہ اُن اقدامات کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہیں، جن سے نوجوانوں کی تعلیم بے سمت نہ رہے۔ اور یہ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے کہ ع

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

حُسنِ تحریر

قارئین کرام، سلام ورحمت!

ہمیں افسوس ہے کہ طلوع اسلام کنونیشن ۸۷ء کے بعد بوجوہ یہ سلسلہ جاری نہ رکھا جا سکا۔ اپریل ۸۷ء کے شمارہ میں محترم پرویزؒ صاحب کی وہ دلنواز اور عقیدت واحترام سے سرشار تحریر آپ کے سامنے آچکی ہے جس میں انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور قدسی کے لیے "صبح بہار" کا عنوان باندھا ہے۔

اس مرتبہ موصوف کی وہ تحریر پیشِ خدمت ہے جس میں انہوں نے فتح مکہ اور مابعد کی تصویر کشی کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ اس تحریر سے کس طرح سیرت رسول اعظمؐ کی رفعتیں اور رعنائیاں نکھر اور ابھر کر سامنے آتی اور دلوں کو سراپا نیاز بنا دیتی ہیں!

محمد عمر دراز

فتح مکّہ

(رمضان ۸ھ جنوری ۶۳۰ء)

تاریک مایوسیوں، اور ظلمت انگیز ناامیدیوں کے اس ہجوم میں، جس میں گھرے ہوئے اس کاروانِ متاعِ توحید وصداقت نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی، دُور، افق سے اس پار، ایک بے صوت صدا تھی جو اپنے دلکش لاہوتی انداز میں اس بے سروسامان، عاجز ودرماندہ، جماعت کے کانوں تک یہ نغمۂ جاں فزا اور مژدۂ روح افزا پہنچا رہی تھی کہ

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (۳/۱۳۸)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) نہ تو ہمت ہارو، نہ غمگین ہو تم ہی سب سے برتر و اعلیٰ ہو اس لیے کہ تم مومن ہو!

گھبرانے اور دل چھوڑنے کی کوئی بات نہیں۔ یہ مظلومی اور یہ بے کسی۔ یہ درماندگی اور لاچاری۔ یہ ضعف و ناتوانی یہ ہجوم نوائب و انبوہ و مصائب۔ یہ تمام نوازل و زلازل۔ یہ ناامیدیاں اور مایوسیاں۔ یہ سب وقتی اور عارضی ہیں۔ انجام کار تمام کامیابیاں اور کامرانیاں، ہر قسم کی تازگیاں اور شادابیاں، قوت و غلبہ، شان و شوکت، جاہ و جلال، شرفِ انسانیت کے تمام مناصب و مراتب تمہارے حصہ میں آئیں گے۔ تمام تاریکیاں کافور ہو جائیں گی۔ ظلمتوں کے بادل چھٹ جائیں گے۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار — نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک — بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے — یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

قرآن کریم میں ہجرت سے کچھ وقت پہلے اور ہجرت کے کچھ عرصہ بعد، اعدائے اسلام کی شکست و ریخت کی منذرات اور جیوشِ حق و صداقت کی فتح و نصرت کی مبشرات، اس تواتر و تسلسل سے نازل ہوئیں کہ گویا مستقبل کی پوری تصویر حال کے آئینہ میں کھنچ کر آگئی۔ (حقیقت یہ ہے کہ حال اور مستقبل کی دیواریں ہماری نارسائی نگاہ کی تعمیر کردہ ہیں۔ خدائے علام الغیوب کے سامنے ان حدودِ فاصل کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ ہجرت کے بعد سرکش قوتوں کی تخریب کے مراحل بتدریج طے پاتے چلے جا رہے تھے۔ لیکن ان کی تکمیل فتح مکہ میں جا کر ہونی تھی، جہاں قانونِ خداوندی کی تائید و نصرت کو یوں بے محابا سامنے آنا تھا کہ کسی آنکھ کو اس کی جلوہ باریوں سے مجال انکار نہ ہو۔ تخریب و ہزیمت کے ان مواعید میں سورۂ لہب کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے کہ اس میں ان سرکش قوتوں کے عجز و درماندگی اور فنا و استیصال کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے۔ پھر اسے سورہ نصر سے متصل رکھ کر جس معجزانہ بلاغت سے اس کے مفہوم کی وضاحت کر دی گئی ہے، چشم بصیرت جب اس پر غور کرتی ہے تو قرآنی حسنِ اعجاز پر وجد کرتی ہے۔

روئسائے قریش میں عتبہ، ابوجہل، ابوسفیان، جیسے سرغنے موجود تھے جنہوں نے نبی اکرمؐ کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ لیکن غور کیجئے کہ قرآن نے ان میں سے کسی کا نام لے کر نہیں کہا کہ وہ بے دست و پا ہو گیا اور اسے اسلام کے مقابلہ میں ہاتھ اٹھانے کی ہمت باقی نہ رہی۔

ابی لہب

نام ابی لہب کا لیا گیا ہے۔ یہ کیوں؟ ابی لہب میں یہ کونسی خصوصیت تھی جس کی وجہ سے اسے خاص طور پر پکارا گیا۔ اور اس کی شکست و ہزیمت کو اسلام کا غلبہ و تسلط شمار کیا گیا۔ یہ چیز غور طلب ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اسلامی نظامِ حکومت میں کعبہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہونی تھی اس لیے اس مرکز پر اقتدار نظامِ اسلامی کے اقتدار کی علامت تھی۔ روسائے قریش میں سے مختلف افراد کے پاس مختلف مناصب تھے لیکن کعبہ کی تولیت ابی لہب کے سپرد تھی۔ قرآن نے ابی لہب کا ذکر کر کے قلب و نگاہ کی تمام توجہات کو اس طرف مرکوز کر دیا کہ نبی اکرمؐ کی اس تمام تگ و تاز اور جنگ و جدل کا مقصد روسائے قریش کی ریاست و قیادت کا حصول نہ تھا بلکہ کعبہ کو پھر سے اس مقام پر لانا تھا جس کے لئے اسے وضع و تعمیر کیا گیا تھا۔ ابی لہب اپنے اس دینی منصب کی وجہ سے دین حقہ کا حقیقی دشمن تھا اور باقی روسائے قریش اس کے تابع تھے۔ اس شخص نے ایک طرف کعبہ کو، جو خدائے واحد کی عبودیت کا مرکز تھا بتوں کا استھان بنا رکھا تھا، اور دوسری طرف اپنی ہوس زر پرستی اور سرمایہ داری کی وجہ سے اپنی اس دینی ریاست سے بہت ناجائز فائدہ بھی اٹھا رہا تھا افادہ کے مال میں جو محتاجوں اور مساکین کی حاجت روائی کے لیے وقف تھا خرد برد کرتا رہتا تھا حتیٰ کہ کعبہ کے خزانے کے سونے کے ہرن چرانے کا الزام بھی اس پر عائد کیا جاتا تھا۔ نبی اکرمؐ کی دعوتِ توحید میں اسے ہر وقت اپنے منصب کے چھن جانے اور اس طرح حصول مال و دولت کے اتنے بڑے سرچشمے کے ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ نظر آتا تھا اس لیے یہ اس دعوت انقلاب کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتا تھا۔ یوں سمجھئے کہ ابولہب، قریش کے اس نظام پیشوائیت کا امام تھا جس میں تقدس آمیز قیادت اور مفت کا مال و دولت، سب حاصل ہو جاتے تھے سرمایہ داری اور ہوس زر پرستی نے اس کے ان تمام جوہروں کو تباہ کر دیا تھا جو قریش کی قومی خصوصیات تھیں یہاں تک کہ یہ شخص بدر کے میدان میں، کہ جس میں قریش کی قومی غیرت و حمیت اپنے خورد و کلاں سب کو کھینچ لائی تھی خود شریک نہیں ہوا۔ عاص بن ہشام کے ذمے اس سرمایہ دار کے چار ہزار درہم قرض تھے وہ بوجہ تنگ دستی اس قرض کو ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اس بخیل نے اس قرضہ کے عوض عاص کی جان خرید لی اور اسے اپنی جگہ میدانِ جنگ میں بھیج دیا یہ تھا وہ ابولہب جس کے پاس تولیت کعبہ جیسا اشرف و افضل منصب تھا۔ ایسے شخص کے بے دست و پا ہو جانے کے اعلان کا کھلا ہوا مفہوم یہ تھا کہ کعبہ کی تولیت ان کے ہاتھوں میں آ جائے گی جو اسے اپنے ذاتی اغراض کے حصول کا وسیلہ نہ بنائیں گے بلکہ اسے نوع انسانی کے قیام (قیاماً للناس) کا ذریعہ بنائیں گے۔ ابولہب جان کے خوف سے بدر میں شریک نہ ہوا،

لیکن قدرت کے فیصلے دیکھئے کہ بدر کے ساتویں دن اپنے گھر میں بیٹھے چیچک کے عارضہ سے مرگیا۔ اس کے دونوں بیٹے موجود تھے لیکن چھوت کے ڈر سے وہ اس کی لاش کے پاس تک نہ آئے۔ یہاں تک کہ لاش پڑی پڑی سڑ گئی۔ دوسروں کی غیرت دلانے پر انہوں نے اس پر دور ہی سے کچھ پانی چھڑکا اور مکہ سے باہر ایک جگہ رکھ کر دور سے پتھر وغیرہ پھینک کر لاش کو ڈھانپ دیا۔ یہ انجام ہوا اس زمانہ کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا اور سرمایہ دار کا مَا اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ یہ انجام تو اس دنیا میں ہوا اور اس کے بعد کی دنیا میں۔

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ

وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں پڑے گا۔

وہ اور اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی۔ اس لیے کہ ابولہب کی زراندوزی کی ہوس اس کی بیوی (ام جمیل) کی وجہ سے تھی۔ یہ اسے مجبور کرتی تھی کہ اس کی زینت و آرائش کے لیے جائز و ناجائز ہر طریق سے مال اکٹھا کرے تاکہ وہ اپنے ساتھ کی دوسری عورتوں میں اکڑ کر چلے۔ وہ اپنے دوزخ کا ایندھن خود اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے گئی (حَمَّالَةَ الْحَطَبِ) اور جس گردن کی سرفرازی کے لیے یہ سب کچھ کیا جاتا تھا اسی میں مکافاتِ عمل کی رسی بندھی جو اسے کشاں کشاں ذلت آمیز عذاب کے جہنم میں لے گئی۔ (فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ) ابولہب اگرچہ بدر کے بعد ہی مرگیا لیکن اس سے کعبہ کی تولیت مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ آئی۔ اس کا وقت اب آرہا تھا۔ اس لیے ابی لہب کی شکست ید (بے چارگی و توانائی مقابلہ سے عاجزی اور مخالفت سے درماندگی) کا اصل وقت فتح مکہ تھا۔ نہ کہ اس کی موت۔ اس لیے ابی لہب کی بے دست و پائی کی تنذیر درحقیقت، فتح مکہ کی بشارت تھی۔

معاہدۂ حدیبیہ کی شرط کے مطابق، مسلمان ۷ھ میں مکہ گئے اور تین دن کعبہ کی زیارت کرکے واپس آگئے چونکہ معاہدہ کی پابندی ضروری تھی اسی لیے مسلمان امن و سکون سے گئے، امن سکون سے ہی واپس لوٹ آئے لیکن قریش اس معاہدہ کو بھی نہ نباہ سکے۔ صلح حدیبیہ کی بناء پر قبائل عرب میں خزاعہ مسلمانوں کے حلیف ہوگئے تھے اور ان کے حریف، بنوبکر، قریش کے۔ ان دونوں قبیلوں میں مدت سے باہمی پرخاش چلی آرہی تھی۔ بنوبکر نے خزاعہ پر حملہ کیا اور قریش نے معاہدہ کے صریحاً خلاف، بنوبکر کی حمایت کی اور عین حرم کے اندر افرادِ خزاعہ کا خون بہایا۔ خزاعہ کے کچھ لوگ نبی اکرمؐ کے پاس مدد کے لیے آئے۔ آپ نے جنگ کی بجائے قریش کو کہلا بھیجا کہ ان تین شرطوں میں سے کوئی ایک مان لی جائے۔

(۱) مقتولین خزاعہ کا خون بہا دے دیا جائے۔ یا
(۲) قریش بنو بکر کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔ اور یا پھر
(۳) اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا صلح نامہ ٹوٹ چکا ہے۔

معاہدۂ حدیبیہ توڑ دیا گیا

قریش کے نمائندہ نے تیسری شرط مانی اور معاہدہ کالعدم ہو گیا۔ اگرچہ انہیں اپنی اس حرکت پر بعد میں بڑا افسوس ہوا لیکن اب ان لوگوں کا اعتبار ہی اُٹھ چکا تھا۔ نبی اکرمؐ نے مکہ پر حملہ کی تیاری شروع کر دی اور اس امر کی احتیاط برتی کہ قریش کو قبل از وقت اس کی اطلاع نہ ملنے پائے۔ حاطب ایک معزز صحابی تھے۔ انہوں نے ایک مخفی خط کے ذریعہ قریش کو اس تیاری کی اطلاع دینی چاہی۔ نبی اکرمؐ کو اس واقعہ کا پتہ چل گیا۔ اور قاصد کو راستہ ہی میں روک لیا گیا۔ یہ منافقین میں سے نہیں تھے۔ اس لیے صدرِ اوّل میں یہ ایک ہی واقعہ ہے جس میں اپنی جماعت کے مفاد کے خلاف کسی سے کوئی حرکت سرزد ہوئی ہو۔ حضورؐ نے جب ان سے پوچھا تو انہوں نے نہایت ندامت آلود نگاہوں سے قرار کیا کہ ان کے عزیز و اقارب مکہ میں تھے جن کا وہاں کوئی حامی نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے قریش پر احسان رکھنا چاہا کہ اس کے صلہ میں ان کے عزیزوں کو کوئی صدمہ نہ پہنچائیں گے۔ یہ ان کی جذباتی کمزوری تھی، قرآنی تعلیم انسان کو ان کمزوریوں سے بلند لیجانا چاہتی ہے۔ لیکن جس لغزش کے ساتھ عرق انفعال ہو وہ قابلِ عفو ہوتی ہے چنانچہ حضورؐ نے اس عذر کو، جسے پر خلوص ندامت سے پیش کیا گیا تھا۔ قبول کر لیا۔

مکہ کی طرف روانگی

رمضان ۸ھ میں "دس ہزار قدوسیوں کی جماعت" کی ہم رکابی میں نبی اکرمؐ عازمِ مکہ ہوئے ۲ھ کا پہلا رمضان تھا جب بدر کے میدان پر اس سلسلہ مبارکِ حق و باطل کی ابتدا ہوئی تھی۔ چھ سال کے بعد پھر روزوں ہی کے مہینہ میں اس کشمکشِ حق و باطل کی تکمیل کا دن آجاتا ہے۔

مکہ سے باہر ڈیرے ڈال دیئے گئے۔ ابوسفیان اس لشکر کی تحقیق کرنے کے لیے خفیہ طور پر آیا۔ لیکن گرفتار ہو گیا۔ یہ سرخیل جیوشِ فراعنہ، اب پابجولاں حضورؐ کے سامنے تھا۔ اس کی ساری عمر انتہائی مخالفتوں میں گذری تھی۔ اس کا ایک ایک جرم اس قابل تھا کہ اس کی سزا میں اس کی گردن اڑا دی جاتی۔ حضورؐ کی نگاہ اٹھی تو اس نے کلمہ شہادت پڑھ کر سر جھکا دیا۔ اس نے کلمہ پڑھا اور ادھر تمام رنجشیں ختم ہو گئیں۔

سارے گلے تمام ہوئے اک نگاہ میں

اب ابوسفیان اس قدر ذی عزت اور قابلِ اعتماد تھا کہ اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا یا دروازے بند کر لے گا۔ یا ابوسفیان کے گھر پناہ لے گا اسے امن دے دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد بغیر

بغیر جنگ کئے[1] حضورؐ مظفر و منصور مکہ میں داخل ہو گئے۔

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝ (۱۷/۸۱)

(اے پیغمبر اسلام! آپ اعلان کر دیجئے کہ دیکھو!) حق آگیا اور باطل نابود ہوا۔ اور باطل اسی لیے تھا کہ نابود ہو کر رہے۔

فتح مکہ

"وہی بے کس و بے بس انسان"، جو آج سے آٹھ سال پہلے اسی مکہ سے رات کے وقت صرف ایک ساتھی کی ہمراہی میں، دشمنوں کی نگاہوں سے بچتے بچاتے نکلا تھا، کسی غیر کی مدد لئے بغیر آج اس جاہ و حشمت سے اسی مکہ میں داخل ہو رہا ہے جو دنیا کے کسی شہنشاہ کو آج تک نصیب نہ ہوئی ہو۔ قدسیوں کی جاں نثار جماعت جلو میں، لوائے حق و صداقت سر پر سایہ فگن اور اللہ اور اس کے فرشتے اس عدیم النظیر کامیابی اور فقید المثال شادکامی پر ہدایائے تحسین و تبریک و تحائف صلوٰۃ و سلام سے گل پاش۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ط يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (۳۳/۵۶)

اس شانِ خسروانہ، اور خدا کے حضور انداز فقیرانہ سے حضورؐ کعبہ کی طرف تشریف لائے۔ کعبہ کے اندر جا کر آپ بحضور رب العزت سجدہ ریز ہوئے۔ اس کے بعد لوگوں کو جمع کر کے ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ دربار حکومتِ الٰہیہ کا پہلا خطبہ سلطنت تھا۔ خطبہ کیا تھا ان تمام اصول و مبانی کا عظیم القدر مجموعہ تھا۔ جس پر حکومت خداوندی کے قصرِ مشید کو استوار ہونا تھا۔ حضورؐ نے بآوازِ بلند فرمایا۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

خطبۂ فتح مکہ

صَدَقَ وَعْدَهٗ۔ قابلِ ہزار حمد و ستائش اور درخور صد ہزار تشکر و امتنان ہے وہ بارگہِ صمدیت جس نے ان وعدوں کو پورا کیا جو اس وقت کئے گئے تھے جبکہ ساری فضا نامساعد اور حالات ناسازگار تھے۔ "نَصَرَ عَبْدَهٗ" اس نے اپنے بندے کی تائید و نصرت فرمائی هَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ اور تمام طاغوتی قوتوں کو منہدم کر کے رکھ دیا۔

يَا مَعْشَرَ الْقُرَيْشِ! اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذْهَبَ عَنْكُمْ نَخْوَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَتَعَظُّمَهَا بِالْاٰبَاءِ

[1] اس میں ایک آدھ خفیف سی جھڑپ ہوئی جو قابلِ التفات نہیں۔

اے قومِ قریش! جاہلیت کا غرورِ باطل اور نسب کا افتخارِ پندار آور، سب خدا نے مٹا دیئے۔

اَلنَّاسُ مِنْ اٰدَمَ وَ اٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ

تمام نوعِ انسان کی اصل ایک ہی ہے اور اس کا سلسلۂ تخلیق مٹی سے شروع ہوتا ہے۔

اَلَا کُلُّ مَاثُرَۃٍ اَوْ دَمٍ اَوْ مَالٍ یُدْعٰی فَھُوَ تَحْتَ قَدَمَیَّ ھَاتَیْنِ

تمام مفاخر، تمام انتقامات سب خون بہائے قدیم مٹ مٹا کر آج میرے قدموں کے نیچے ہیں۔
اب مساواتِ انسانی اور احترامِ آدمیت کا دور آگیا۔ اب عزت و تکریم کا معیار، حسب و نسب نہیں۔ بلکہ جوہرِ ذاتی ہوگا۔

برخیز! کہ آدم را ہنگامِ نمود آمد
این مشتِ غبارے را۔ انجم بسجود آمد

خطبہ کے بعد مجمع پر نگاہ ڈالی تو تمام متکبرین و مستبدینِ قریش سامنے کھڑے تھے، ان میں وہ بھی تھے جنہوں نے اس دن اِس دعوتِ حق و صداقت کی تضحیک و تحقیر کی تھی جب حضورؐ نے پہلے پہل صفا کی پہاڑی سے اللہ کا نام اس کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور پھر جنہوں نے اس دن سے لے کر آج تک اپنی زندگی کی تمام توانائیاں اس تحریکِ انقلاب کی مخالفت کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔ وہ بھی تھے جنہوں نے جتھہ بنا کر سازش کی تھی۔ کہ شبِ ہجرت، سب مل کر اس داعی الی اللہؐ کو (معاذ اللہ) ختم ہی کر دیا جائے۔ اور یہ سب اس جرم میں کہ وہ یہ کیوں کہتا ہے کہ "رَبُّنَا اللّٰہُ"۔ میرا رب صرف اللہ ہے۔ اور یہ دوسری طرف وہ ہیں جنہوں نے بدر کے میدان میں اپنی تمام قوتوں کو اس لیے جمع کر دیا تھا کہ یہ مٹھی بھر جماعت جو دنیا میں خدا کا نام لیتی ہے، دنیا سے مٹا دی جائے۔ اور یہ وہ ہیں جنہوں نے اُحد کے میدان میں حضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کو شہید کیا۔ اور خود حضورؐ کو بھی زخمی کر دیا۔ اور وہ دیکھو انہی میں وہ خاتون، ہندہ ہے جس نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبایا۔ یہ سب مفتوح و مغلوب سامنے کھڑے ہیں۔ اور دوسری طرف فاتح و منصور، نبی اکرمؐ کہ جنہیں دنیا کا کوئی قانون اور عدل کا کوئی گوشہ ان مجرمین کے قتل سے نہیں روک سکتا۔ حضورؐ نے ان کی طرف دیکھا اور ان سے پوچھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟ انہوں نے کہا کہ یہ تو معلوم نہیں لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ تو شریف بھائی ہے اور شریف زادہ ہے، یہ انہوں نے ازراہِ تملق نہیں کہا تھا، تملق اور خوشامد تو عرب کے کیرکٹر سے بعید تھی۔ انہوں نے ایک حقیقت کا اعتراف کیا تھا۔ نبی کی سیرت ہی یہ ہے کہ وہ ہر مقام پر شرافت کا مجسمہ ثابت ہو۔ انہوں نے اس حقیقت کا اعتراف آج اس شکست خوردنی کے عالم میں ہی نہیں کیا تھا بلکہ نجاشی اور ہرقل

دربار میں، جب ایک فریق غالب کی حیثیت سے گئے تھے تو اس وقت بھی یہی کہا ھا. حضورؐ نے نگاہ اٹھائی اور ان سے کہا کہ

لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ - اِذْھَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ

آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

عفو جس کی قرآن میں تعریف کی گئی ہے۔ نہ کہ اہمسا، کا وہ عفو کہ جس میں "عصمت بی بی از بیچارگی" کا رہ ہو۔ عفو اسی کا قابلِ ستائش ہے جس میں انتقام کی پوری پوری قوت موجود ہو۔ قریش نے اجرین کے مکانات پر قبضہ کر رکھا تھا۔ آپ نے مہاجرین سے کہدیا کہ اپنے حقوق سے دست بردار ہو جائیں۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھئے، اور یہ دیکھئے وہ سامنے کون ہے! یہ عثمان ابن طلحہ شیبی ہے جس کے پاس کعبہ کی کلید رہتی تھی۔ ہجرت کے وقت حضورؐ اس کے پاس آئے اور کہا کہ ذرا کعبہ کا دروازہ کھول دو تو میں اس کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو تسکین دے لوں۔ اس نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ آپ خاموشی سے واپس آگئے لیکن اتنا کہا کہ خیر! آج تم میری خاطر دروازہ کھولنے کے لیے تیار نہیں ہو، تم مختار ہو۔ لیکن وہ وقت بھی آنے والا ہے کہ یہی کنجی میں جس کے ہاتھ میں دے دوں گا، قیامت تک اس سے کوئی چھین نہیں سکے گا۔ آج کعبہ کی وہی کنجی آپؐ کے ہاتھ میں تھی اور وہی عثمان سامنے کھڑا تھا۔ آپ نے پوچھا، تمہیں وہ واقعہ یاد ہے۔ اسے یاد تھا۔

سب کی نگاہیں منتظر تھیں کہ دیکھیں یہ کلید متاعِ دارین کسے عطا کی جاتی ہے! آپ آگے بڑھے اور معلوم ہے کہ یہ کنجی کس کے ہاتھ میں دے دی؟ اُسی عثمان کے ہاتھ میں! اللہ اکبر! اس ترحمِ خسروانہ اور نوازشِ شاہنشاہانہ کی نظیر اور کہاں مل سکتی ہے؟ یہ کنجی آج تک اسی عثمان کی اولاد میں منتقل ہوتی چلی آرہی ہے۔ اگرچہ خلافت کی جگہ ملوکیت آجانے سے، یہ کنجی بھی، مذہبی پیشوائیت کی ہوس زراندوزی کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔

لاہور میں محترم پرویز صاحبؒ کا درسِ قرآن کریم
بذریعہ — وی سی آر (V.C.R) ہر جمعہ کو صبح ۹ بجے
۲۵-بی، گلبرگ ۲ لاہور میں ہوتا ہے۔ (ناظم)

قارئینِ طلوعِ اسلام کیلئے

خوشخبری

ایک عرصہ سے نایاب کتب کے

تازہ ایڈیشن — چھپ گئے ہیں!

(۱) **ختمِ نبوّت اور تحریکِ احمدیّت**

بڑا سائز (۲۰×۳۰/۸) جاذبِ نظر گرد پوش

قیمت: مجلّد -/۴۵ روپے

(۲) **قرآنی فیصلے** (حصّہ اوّل) بڑا سائز، حسین گرد پوش

جس میں سابقہ اوّل، دوم اور سوم جلدیں آگئی ہیں! ضخامت ۵۸۲ صفحات

قیمت: -/۹۰ روپے

(۳) **لغاتُ القرآن** جلد چہارم۔

قیمت: -/۷۵ روپے

چار جلدوں کا مکمل سیٹ۔ قیمت: -/۲۵۰ روپے

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

WHAT IS WRONG WITH US ?

[The Paper read by (Miss) Shamim Anwar on the occasion of Second Death Anniversary of Late Allama Ghulam Ahmed Parwez on February 27, 1987.]

Ladies and Gentlemen:

Since I stood here before you on this platform full one year ag the Pakistani nation, that is, you and me, and everybody else ha been pre-occupied with the question: What is wrong with us? What ails us? Copious journalistic literature has been produced in the form of feature articles, editorials and letters. The climax came when the President of the country summoned a conference of 500 (bureaucrats, military generals, ulemas and intellectuals) to identify the problem number one of Pakistan. Immediately, the opposition held its own conference declaring that the President himself was the problem number one! (It is another matter, that the vested interests in the country think that 'Zia is the president, all's well with Pakistan'). This whole exercise of identifying our ailment, our problems, brought forth some suggestions. For instance, elections on the basis of 1973 constitution, abolition of corruption, sectarianism and disunity etc.. I am afraid all these are, at best, superficial explanations and suggestions, in fact all these are not the actual problems or the causes of our decadence. They are the results, the consequences of causes that lie buried deep in our history, and deeper still in our national psyche.

However, to face these realities, to face the truth about ourselves demands courage and honesty. The Quran defines 'truth' as fact, i.e. 'Fact' is the 'Truth'. In recent history Sir Syed, Iqbal and Parwez as thinkers and scholars, and again Sir Syed and Jinnah as practical Statesmen, are models before us who confronted realities as they were, no matter how ugly and unpleasant they may be. It is a pity that the people who claim these great leaders as their own are today internationally ridiculed as ostriches and pigeons. It is high time the nation pulled its head out of the sand and opened its eyes.

I shall naturally attempt to talk in the light of Quranic

ttitudes and values. If there are any mistakes and lapses the esponsibility, of course, is entirely mine.

As a student of history, my understanding of the past one thousand years in the Indo-Pak subcontinent is a history of conquest and subjugation by imperial forces, forces that labeled themselves as 'Muslims'. They came from Arabia, Iran, Central Asia and Afghanistan. Now, imperialism is imperialism; it does not become good by adding the prefix 'Muslim' to it. We cannot say 'British' imperialism is bad, and 'Muslim' imperialism is good. If there were, incidentally, some positive results of the 'Muslim' impact, so were there of the 'Britist' impact, ever more so. However, at the moment I am concerned about the psychological impact on those who conquer and subjugate and rule over other people. The whole process is self-defeating because it leads to negative characteristics and dehumanisation of the rulers themselves. They become arrogant, cruel and unjust. They act as bullies and start suffering from superiority complex, thinking they are always right. They refuse to listen to others, particularly those from amongst the enslaved. One disqualification of Moses, in the eyes of Pharaoh, was that Moses belonged to the conquered and enslaved subjects. Eventually, by destroying others, they end up by destroying their own selves.

Now, those who are enslaved, like we ourselves were for more than two hundred years by the British, also develop equally negative characteristics. They become cowardly, deceitful, sycophantic and crooked; they start suffering from inferiority complex, losing confidence, initiative and leadership qualities; they are no longer creative and inventive, and are unable to think for themselves; they become lazy, dependent and highly emotional people. In short, they cannot stand on their own feet, and are ever ready to sell themselves at the first opportunity.

I am sure you have already got the point I am trying to make. Since we have a combination in our national psyche, the negative heritage of both the conqueror and the conquered, the picture that looms large before us is a horrifying one. The mixture of the above mentioned characteristics means that we are denied the great human qualities of a living dynamic people like love for freedom, courage, pride, the ability to say 'No' even to God, absence of the fear of death, upright, and a commitment to ones promise made, even at the cost of ones life. In order to comprehend Quran and accept its challenges, one has to be a living

people; to the dead and decadent people, with weak minds, a s stirring Message of Islam, which infuses a spirit of freedom responsibility and which not only urges to stand on ones feet even to accept the leadership of protecting the victims injustice anywhere in the world, is beyond their ken. No wond during the 1937 election, Quaid-e-Azam in exasperation lament Muslim are either the camp followers of the Congress or bo lickers of the British. In his book 'Mairaj-e-Insaniat' Par Sahib has pin-pointed that in the 6th century A.D. world culture only the Arabs, who had been till then neither the conquerors n the conquered had the ability to be the recipient of such Message and such a Mission. The character of the pre-Islamic Arabs is replete with anecdotes of valour, daring, and love of freedom. It is incorrect on the part of writers on Islamiat or so-called 'Islamic History' to say that the last Nabi was revealed to the Arabs because they were worst of the lot. On the contrary, they were the best. It is another matter that when these Arabs indulged in imperialism themselves, they lost their character. That is why Allama Iqbal, in his 1930 Address at Allahabad, said that (Pakistan idea) aimed at wiping off "the stamp of Arab imperialism from Islam".

At this stage, one wonders why Iqbal chose this area to experiment such an elevating and challenging vision of humanity. In the context of what I have said above, it does not appear to be the right choice. But Iqbal did have definite conditions and reason for his choice. I have Parwez Sahib's authority to state the following: It so happened that the north-western part of India, which is Pakistan today, apart from being a Muslim majority area, was reserved by the British for recruiting soldiers for the British Indian army. So this area was not industrialised or else people would have sought jobs in the factories. Hence the vested interests of the Big Industry and Big Business did not develop here. The only vested interests were the landed feudals who had been gifted land by the British for helping them during the Great Revolt of 1857. To them a strong warning was given by Jinnah. Iqbal had already ferociously attacked them in his poetry.

Secondly, the British were eventually withdrawing from India. This would automatically create a vacuum to be easily filled in by a new revolutionary government. This was not possible anywhere else in the so-called 'Muslim' world because there were already well-entrenched systems and governments difficult to be uprooted. It is a tragedy that we are faced with a similar situation in

istan today. All kinds of vested interests have taken root and re is a government in existence that safeguards these erests. A very clever 'think-tank'is perpetuating the status o, rather regressing, by woman bashing and through the mpulsory subjects of Islamic and Pakistan Studies. But this ordid tale will have to be told some other time. Shortage of ime does not permit me to speak on it now. Moreover, I would like o draw your attention to a strange hypocritical situation that revails within us and in the root of our existence as Pakistanis. ere I would like to quote Khushwant Singh, an Indian journalist, no has visited Pakistan many times. In his 'Around the World' (a ollection of articles on his travels) he says: "This two-nation heory that the Pakistanis swear by is a lot of hogwash And hey know it." This is typical of his bawdy language, but my bservation about the intelligentsia of Pakistan confirms this iewpoint. People who matter, the opinion-makers and decision-akers, inwardly among themselves, do not believe in it, but utwardly they continue to repeat it without any comprehension. nstead of re-searching it themselves, they have lost the game by efault by leaving it to the Mullah. The consequences are that he nation has lost its sense of direction and commitment. One nly has to stand by on the road side and watch the traffic pass y to realise the characterlessness of the nation. Without ommitment, without the sense of loyalty and pride, a national haracter cannot be developed. For instance, even a gang of thugs isplays extraordinary character within the gang, abiding by its ules and regulations, though outside the gang the thugs are upposed to murder and plunder their fellow human beings. We are ot even like those thugs.

fter having said all this, the question arises: What is our hope or tomorrow? Surely, we cannot end on a frustrating and pessimis-ic note.

ne glimmer of light that I see in this very dismal scenario is hat the people of Pakistan have never been pro-Mullah. Whenever here has been a choice between a Mullah and a non-Mullah, they ave always chosen the latter. Our 40 years of history proves it. or example, in the 1946 elections, the people chose Jinnah, and ejected the Mullah; in 1965, the one organised party, the Jamaat-e-Islami acquired only one seat in the National Assembly, it was yub and other politicians who got rest of the seats: in 1970,they anaged to acquire only 4 seats against Bhutto and others. They ared no better in the 1977 or the so-called 1985 elections. It

is the anti-Mullah stance of the people that will work f a better tomorrow, if and when a leader emerges who has the ca e and stature of a Jinnah. He will not be the one who will games with the priesthood to seek cheap popularity. Secondl is the grass root education as visualised by Sir Syed's Al educational movement that has been our saviour, and hoping tl am not speaking too soon. we have so far, escaped Khomenies.

Actually, this was the thrust of Parwez Sahib's desperate att at establishing a residential college on Sir Syed's model, and this very reason it was thwarted by the powers that be. Thi an area where we must continue our struggle, a goal where attention must be constantly directed. There is no substitute education in bringing about a permanent change in the attitude and values of the society.

However, I would say that a particular piece of land is no more sacred than another. The whole planet, Earth, is the homeland of the human family. Wherever the atmosphere is conducive, wherever there exists a people with the character of the Arabs of the 6th Century A.D. the Quranic experiment can be made. Where we have failed, somebody else may succeed. We are not the chosen people, nobody is! This was the rationale behind Parwez Sahib's project of translating into English his 'Mafhumal-Quran' and other books. He wanted to speak to a bigger and wider audience. He did not succeed in this either and he felt desperate about it in the last days of his life. To translate his books into English is a debt we owe him.

In any case, seen from the universal angle, the human race is moving in the direction its creator wanted it to move. Only it is too painful and too prolonged and torturous a route it has taken. Who will be the lucky people who will succeed in economising this effort and time, as Iqbal puts it, only time will tell.

(Miss) Shamim Anwar
Kinnaird College,
Lahore.